کامریڈ شیخ چلی

(طنز ومزاح)

کنہیالال کپور

نذیر سنز پبلشرز

40اے اردو بازار لاہور فون: 042-37123219

info@nazeersons.com

تعارف

کنہیالال کپور کا شمار برصغیر پاک و ہند کے ان ممتاز طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مزاحیہ تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کی نئی نئی جہتیں دریافت کیں۔

ان کی تحریروں میں معاشرے میں پائی جانے والی سماجی برائیوں کے بارے میں بڑے دلگداز، دلنشین، منفرد اور اچھوتے انداز میں نشاندہی کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں انہوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف سماجی برائیوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ انہیں تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بڑی بے دردی اور ہنرمندی کے ساتھ شدید چوٹیں بھی کی ہیں۔ ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ایک سنجیدہ قاری بھی اپنی بے اختیار ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اگرچہ ان کی کہانیوں میں کہیں بھی گہرائی کا عنصر نظر نہیں آتا تاہم معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کی حقیقتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریر میں شگفتگی کے علاوہ کئی ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جو سب کام کی چیزیں ہیں۔ انہی سامنے رکھتے ہوئے کنہیالال کپور نے آنے والے مزاح نگاروں کو نئی راہوں بتلایا ہے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ خود کو زندگی کے جھمیلوں سے آزاد کر کے چند گھنٹوں کے لیے کنہیالال کپور کی کہانیاں پڑھیں اس سے کم از کم یہ ہوگا کہ آپ کا وہ دن بہت اچھا گزرے گا اور آپ آئندہ کے لیے بھی کنہیالال کپور کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

کنہیالال کپور کی طنزیہ، مزاحیہ کہانیوں میں جو ثقافت، کاٹ، نشتریت اور وسعت پائی جاتی ہے وہ شاید اردو کے کسی دوسرے طنز نگار کے ہاں ملنا مشکل امر ہے جو قارئین ظرافت کے عنصر کو پسند کرتے ہیں کنہیالال کپور کی تحریروں کو پڑھ کر ان کی امنگیں مزید جوان ہو جائیں گی اور مسرت و شادمانی ان کی زندگی کا حصہ بن جائے گی۔

☆……☆……☆

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر
علامہ ظہور	7
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے!	11
فلسفہ قناعت	16
کامریڈ شیخ چلی	18
فلمی شاہکار	24
تعاقب	27
روٹی تو کسی طور......	31
کاٹھ کا الو	34
وزیر ٹیکس	40
پیغام	47
مس چنبیلی	52
جمود	58
نور کا تڑکا ہوا	63
دیسی فرنگی کا دربار	66
بابا کے مزار پر	71
تہمت	74
مرزا جگنو	78
گوہر مخزن ظرافت	81
شاطر صاحب	86
مرزا نکتہ	90
نائی	93
آپ بیتی	97
میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ	102
جانور کتنے خوش نصیب ہیں	106
معلومات کا انسائیکلوپیڈیا	109
ایک پہیلی	113
پانچ قسم کے بےہودہ خاوند	117
ایک عبرتناک داستاں	120
مرزا لطیفہ	123
تازہ تخلیق	127
مانگے کی کتابیں	131
انصاف کہاں ہے	135
خدام ملت	138
ایک آرٹسٹ	144

ریڈیو خریدا ہے!	149
چینی شاعری	154
بڑے آدمی	159
انتساب	164
نام	169
رومان کی تلاش	172
رہیے اب ایسی جگہ چل کر	178
سنانے کا مرض	183
اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے	188
اخبار بینی	195
قومی لباس	198

علامہ ظہور

علامہ ظہور کی وفات کے دو ہی گھنٹے کے بعد لوگوں نے ان کی زندگی، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا، کہ ملک کا ہر چھوٹا موٹا نقاد، افسانہ نویس اور شاعر اگر علامہ کا ہم نوالہ نہیں تو ہم پیالہ ضرور تھا۔ اخبارات و رسائل نے ''ظہور نمبر'' نکالے۔ ادبی مجلسوں نے ''ظہور میموریل'' قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بہی خواہان ملت نے ظہور کبڈی ٹورنامنٹ، ظہور لانڈری اور ظہور فٹ بال کلب بھی قائم کرنے کی سعی بلیغ کی۔ مقرران آتش نوا نے علامہ کے کلام پر تقریریں کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔

الغرض علامہ کی موت ہر ایک شخص کے لیے رحمت بار ثابت ہوئی۔ جو شخص بھی علامہ ظہور پر مضمون لکھتا، ہفتوں اس کا مجلسوں میں اس طرح استقبال کیا جاتا۔ ''یہ صاحب علامہ کے گنتی کے چند دوستوں میں سے ایک ہیں''۔ شہرت حاصل کرنے کا اس سے نادر موقعہ شاید ہی کسی کو ملا ہو۔

یہ سب باتیں مرزا ظریف ہر روز دیکھتا، اور پڑھتا، اور دل ہی دل میں کڑھتا، کہ وہ شخص جن کو علامہ کی زندگی میں ان کے در کی چوکھٹ دیکھنے کا بھی موقع میسر نہیں ہوا، ان کی موت کے بعد اس طرح باتیں کرتے ہیں گویا ان کی ساری عمر صرف علامہ کی ہی گھر کٹی۔ مثلاً ایک افسانہ نویس نے، جس کا نام تک اس سے پہلے کسی شخص نے نہیں سنا تھا، لکھا ''میں اور علامہ ہمیشہ ایک چارپائی پر سوتے تھے۔ اگر چہ علامہ بے حد فربہ بدن واقع ہوئے تھے اور تنگ چارپائی پر سونے کی وجہ سے انہیں کبھی کبھی ساری رات نیند نہ آتی تھی۔ مگر دلی خلوص کا یہ حال تھا، کہ کبھی زبان سے اف نہیں کی۔ برابر پچاس سال وہ میرے ساتھ اسی کھاٹ پر سوتے رہے''۔ ایک صاحب جو کسی گمنام اخبار کے ایڈیٹر تھے، اس طرح رقم طراز ہوئے۔

''علامہ دوپہر کا کھانا ہمیشہ میرے ہاں کھاتے تھے۔ علامہ کو ٹماٹر سے جتنی رغبت تھی، اتنی ہی بینگن سے نفرت تھی، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک رکاب کو، کہ جس میں بینگن کی بھاجی تھی، اس زور سے فرش پر پٹک مارا کہ پنگوڑے میں سویا ہوا بچہ خواب میں چیخ اٹھا۔''

اس مضمون کو پڑھ کر ایک پروفیسر صاحب جھلا اٹھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قوم کو یہ جاننے کی

اتنی ضرورت نہیں کہ علامہ کون کون سی سبزیاں زیادہ پسند فرماتے تھے، جتنی اس امر کی کہ ان کے پسندیدہ پھلوں کے نام کیا تھے۔ چنانچہ اسی دن انہوں نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا۔ ''علامہ انگور اور کیلا بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ کھجور ان کا من بھاتا پھل تھا، مگر انار سے انہیں ازلی نفرت تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ ایک دفعہ جب وہ میرے دیوان خانے میں بیٹھے تھے، میں نے غلطی سے انہیں ایک قندھاری انار پیش کر دیا، اس کو دیکھتے علامہ کو متلی شروع ہو گئی اور پورے دو گھنٹے کے بعد مشکل سے ان کی طبیعت سنبھلی''۔

2
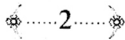
تعجب کی بات یہ تھی کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے، علامہ مرحوم کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا۔ ان کے دوستوں کے زمرے میں ہر قسم اور ہر شعبہ کے لوگ شامل تھے۔ پروفیسر، ادیب، حکیم، پنساری، سپاہی، باورچی۔ سائنٹسٹ۔ جو مضمون نگار چھوٹے طبقے سے ہوتا اور جس کو اپنی کم مائیگی کا زیادہ احساس ہوتا، وہ اپنے مضمون کی تمہید اس طرح باندھتا۔ ''علامہ کے ہاں چھوٹے اور بڑے کی تفریق نہ تھی، وہ ایک قلی سے مصافحہ کر کے اتنے ہی خوش ہوتے تھے، جتنے ایک شہنشاہ سے۔ میں کئی دفعہ ان کے مکان پر ان سے ملا، اور انہوں نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے مجھے شرف ملاقات بخشا''۔

جس مضمون نگار نے اپنے مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانا ہوتا، وہ علامہ کے متعلق فرضی کہانیاں گھڑ کر مصمون میں ٹھونس دیتا۔ مثلاً ایک صاحب نے جو کسی امریکن بیمہ کمپنی کے ایجنٹ تھے لکھا۔ ''ایک دفعہ دوران گفتگو میں میں نے علامہ سے کہا۔ کہ آپ اپنی زندگی کا بیمہ کیوں نہیں کراتے۔ اس پر علامہ مسکرا دیئے اور کہنے لگے۔ کہ بیمہ وہ کرائے جس کو موت کا ڈر ہو، میں تو موت کو راحت ابدی قصور کرتا ہوں، موت تو دروازہ ہے، جس میں سے گزر کر انسان بہشت میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بار بار یہ شعر دہرایا۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

علامہ نے یہ شعر کچھ اس طرح ادا کیا کہ مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔ چنانچہ اس دن میں نے توبہ کی کہ آئندہ کسی شاعر، فلسفی، یا علامہ کا بیمہ نہیں کروں گا''۔

ایک سیاسی لیڈر نے لکھا:

''علامہ ہمیشہ مجھ سے سیاست پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں دقیق سیاسی مسائل کو سمجھنے کی قابلیت نہ تھی مگر پھر بھی وہ ایک نہایت زبردست سیاست دان تھے۔ جب پہلے پہلے نہرو رپورٹ شائع ہوئی تو علامہ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انہیں ساری کی ساری رپورٹ پڑھ کر سمجھاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا''۔

ایک اور صاحب نے جنہیں مصور ہونے کا فخر حاصل تھا لکھا ''علامہ فن مصوری میں ہمیشہ گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا، کہ آپ کے خیال میں محبت خوبصورتی پیدا کرتی ہے یا خوبصورتی محبت' علامہ نے فرمایا۔ یہ امر بحث طلب ہے۔ بہر حال میرے خیال میں محبت خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اس بندریا کو دیکھئے کہ جس کو میں نے پال رکھا ہے۔ میرے لیے یہ دنیا کی حسین ترین چیز ہے، اتنی حسین کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی خوبصورت سے خوبصورت رقاصہ، دلہن یا ایکٹرس میری آنکھوں میں ہیچ ہے۔ میں یہ سن کر تصویر حیرت بن گیا کہ جس مسئلہ نے مجھے مدتوں پریشان رکھا، علامہ نے ایک عام فہم مثال سے اس کو میرے ذہن نشین کر دیا''۔

3

مرزا ظریف نے علامہ کو اپنی زندگی میں ایک آدھ بار دو یا تین سو گز کے فاصلے سے دیکھا تھا، ایک دفعہ جب کہ وہ ایک مجلس کے صدر کے فرائض دے رہے تھے اور دوسری دفعہ جب کہ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو رہے تھے۔

چنانچہ ان دو ملاقاتوں کی بنا پر انہوں نے بھی علامہ پر قلم اٹھانے کی جرات کی۔ ایک لحاظ سے وہ حق بجانب تھے، کیونکہ کم از کم انہوں نے علامہ کی شکل تو دیکھی تھی، یہ علیحدہ بات ہے کہ انہیں ان سے گفتگو کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ اگر علامہ دس بیس برس اور زندہ رہتے تو ضرور ملاقات ہو جاتی، پھر جب کہ ہر ایک آدمی علامہ پر کچھ نہ کچھ لکھ رہا تھا، وہ کیوں چپ بیٹھتے۔ چنانچہ رسالہ ''انجم'' کے ''ظہور نمبر'' میں مرزا ظریف نے 36 صفحے کا ایک مضمون رقم کیا جس کے ضروری اقتباسات نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

''میں علامہ کو سب سے پہلی دفعہ سرور مرحوم اور دبیر مرحوم کے ساتھ ان کی کوٹھی پر ملا۔ جس

وقت دبیر نے میرا تعارف علامہ سے کرایا، علامہ اس وقت اپنی ڈاڑھی میں سے ایک سفید بال مونچنے سے نکال رہے تھے۔ آپ پہلے ہی دن مجھ سے کچھ ایسے مانوس ہو گئے، کہ رات کو میری دعوت اپنے گھر کی، اور کھانا کھلا کر اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر چھوڑ آئے۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں، اکثر وہ خود شام کو میرے گھر تشریف لاتے تھے اور آدھی آدھی رات تک اپنی بذلہ سنجی سے مجھے محظوظ کرتے تھے۔ ان موقعوں پر عجیب سماں بندھتا تھا۔ ایک دفعہ علامہ کو ایسی زبردست چھینک آئی، کہ میز پر پڑی ہوئی تینوں موم بتیاں بجھ گئیں۔ اتنے میں ایک بلی کا بچہ پھدک کر علامہ کی ٹوپی پر آ بیٹھا، اور علامہ بھوت بھوت کہہ کر کمرے سے نکل بھاگے۔

ایک دفعہ علامہ میرے ساتھ دوکان پر چائے پی رہے تھے کہ ایک بڑی لمبی ریش والا مولوی داخل ہوا، اور کہنے لگا کہ "علامہ آپ مزے سے چائے پی رہے ہیں۔ ادھر قوم تباہ ہو رہی ہے"۔ یہ سن کر علامہ کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ چائے کا پیالہ ان کے ہاتھوں سے گر پڑا، اور ان کی انکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی......

ایک دفعہ علامہ غلطی سے پاجامہ الٹا پہن کر میرے ہاں تشریف لائے۔ میرے پاس اس وقت رحیم مرحوم بیٹھے تھے۔ ہم دونوں علامہ کو دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ مگر علامہ کو پھر بھی اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا۔ جب ہم نے پاجامہ کی طرف اشارہ کیا، تو کہنے لگے، کہ "بھئی جس وقت میں شعر موزوں کرتا ہوں، مجھے اپنے لباس کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ چنانچہ انہوں نے کوٹ اتار کر دکھایا، کہ قمیض بھی الٹی پہن رکھی ہے"......

بیمار ہونے سے ایک ہفتہ پہلے انہوں نے میرے ہاں شام کا کھانا کھایا، رخصت ہوتے وقت کہنے لگے "مرزا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ آخری دعوت ہے"۔ میں ان الفاظ کا کچھ مطلب نہ نکال سکا۔ مگر افسوس کہ یہ الفاظ صحیح پیشین گوئی سے لبریز تھے۔ اسی دعوت کے متعلق مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ علامہ جاتی دفعہ بجائے اپنا بوٹ پہننے کے غلطی سے میرا بوٹ پہن کر چل دیئے۔ راستہ میں خیال آیا، اور پھر واپس آئے۔

بیماری کے دوران میں اکثر مجھ سے تخلیہ میں بات چیت کرتے۔ مرنے سے چند منٹ پیشتر انہوں نے اپنے تازہ کلام کا مسودہ میرے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی ظریف! یہ امانت تم ہی سنبھال سکتے ہو۔ دیکھنا اس کی اشاعت میں تاخیر نہ کرنا کیونکہ اس میں قوم کے لیے ایک تازہ

پیغام حیات چھوڑ کر مر رہا ہوں''۔

ان الفاظ کے ساتھ علامہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ ممکن ہے میں نے اس کا مطلب غلط لیا ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں، وہ اس لیے خوش تھے کہ ان کا آخری کلام المعروف بہ ''چراغ سحری'' محتاط ہاتھوں میں دیا گیا تھا''۔

4
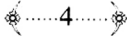
اس مضمون کے چھپنے کے دو تین دن بعد مرزا ظریف کا شمار علامہ ظہور کے جگری دوستوں میں ہونے لگا۔ اور ہزاروں ادیب، ایڈیٹر نقاد، ان کے مکان (واقعہ کوچہ زرگر) پر ''چراغ سحری'' کا مسودہ (کہ جس کو مرزا نے نہایت شکستہ حروف میں ایک رات بارہ بجے تک بیٹھ کر لکھا تھا) دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔

☆☆☆

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے!

ٹیگور، اقبال، کوہمالہ اور تاج محل کے علاوہ اپنے وطن میں بہت سی ہستیاں اور اشیا قابل ستائش ہیں، مثلاً مچھر، شاعر۔ عشاق۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر، مگر بہر حال دونوں کافی تعداد میں ہیں۔ مچھروں اور شاعروں میں اس لیے بھی مطابقت ہے کہ دونوں شمع روشن ہونے پر بھنبھنانا شروع کرتے ہیں۔ نیز جس طرح مچھروں کی کئی قسمیں ہیں، اسی طرح شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہیں (1) شاعر جو اپنا کلام طبلہ اور سارنگی کے ساتھ گا کر سناتے ہیں۔ (2) شاعر جو ساری عمر حکومت کے برخلاف نظمیں لکھتے ہیں اور آخر میں کسی سرکاری محکمے میں نوکر ہو جاتے ہیں (3) شاعر جو اپنی نظم کا گراموفون ریکارڈ اپنی آواز میں تیار کرواتے ہیں اور پھر اسے خود ہی فروخت کرتے ہیں۔ (4) شاعر جو صرف طوائفوں کے لیے لکھتے ہیں۔ (5) شاعر، جنہوں نے شاعری سکھانے کے کالج کھول رکھے ہیں...... شعرا کے بعد اپنے وطن میں عشاق کا نمبر آتا ہے۔ عشق ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ چنانچہ اپنے وطن کا ہر شخص مجنوں اور کوہکن کا نام لیوا ہی نہیں، بلکہ خود مجنوں اور کوہکن ہے۔ عشاق کی صف اول میں کالجوں

کے طالب علم ہیں۔ان کا عشق ''والہانہ عشق'' کہلاتا ہے۔ان کو ہرلڑکی اور ہرعورت سے عشق ہو جاتا ہے۔بازار میں سے گزرتی ہوئی عورتوں سے، ٹانگہ یا موٹر میں سوار کالج کی لڑکیوں سے،سکولوں کی استانیوں سے،ہسپتالوں کی نرسوں سے،سینما کی ایکٹرسوں سے،خوبصورت چینی لڑکیوں کی تصویروں سے۔ان کے اظہار محبت کے طریقے بھی نرالے ہیں۔معشوق کی طرف گھور گھور کر دیکھنا،معشوق کے قریب سے سرک کر گزار جانا،اس پر آوازے کسنا،اس کا نام کالج کی دیواروں، تختہ سیاہ اور بنچوں پر لکھنا۔اس پر کاغذ کے غبارے یا چاک کے ٹکڑے پھینکنا۔ طالب علموں کے بعد عشاق کا دوسرا بڑا گروہ دکاندار طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ان کا عشق ''سوقیانہ عشق'' کہلاتا ہے۔انہیں ہر خوبصورت سودا خریدنے والی سے عشق ہو جاتا ہے۔یہ اپنے عشق کا اظہار تب کرتے ہیں جب معشوق دکان سے باہر چلا جاتا ہے۔اس کی عدم موجودگی میں اس کے خدوخال،شوخی وشرارت کا تذکرہ چٹخارے لے لے کر دکان کے دوسرے آدمیوں یا ہمسایوں سے کیا جاتا ہے۔عشاق کی تیسری جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پیر سال یا قریب المرگ ہیں۔ان کا عشق ''صوفیانہ عشق'' کہلاتا ہے۔ان کا مقولہ ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے۔یہ عبادت گاہوں مندروں اور جلسوں میں عورتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دلی تسکین حاصل کرتے ہیں۔عشاق کی آخری جماعت وہ ہے جس کا عشق ''غائبانہ عشق'' کہلاتا ہے،اس جماعت کے افراد کو نادیدہ محبوب سے عشق ہو جاتا ہے۔جیسے ریڈیو پر گانے والی تمام طوائفوں سے۔خوبصورت برقع میں چلنے والی عورتوں سے، ہالی وڈ میں کام کرنے والی ایکٹرسوں سے،ملک کی ہرنامور ادیبہ اور شاعرہ سے۔

2
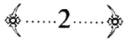
اپنے وطن میں ادبا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔یہ صحیح ہے کہ انہیں کوئی شریف آدمی محلے میں مکان کرائے پر نہیں دیتا اور کوئی شخص ان کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہتا اور ان کو ان کی نظموں اور مضامین کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔مگر پھر بھی ان کا کافی احترام کیا جاتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی ادیب ہوا پر پلتے ہیں۔چنانچہ جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے، اتنا ہی وہ افلاس زدہ ہوتا ہے۔اور سب سے بڑا ہندوستانی ادیب وہ ہے جس

کے مرنے پر اس کے کفنانے اور دفنانے کے اخراجات میونسپل کمیٹی کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔امریکہ اور انگلستان میں جب مصنف مرتے ہیں تو اپنے پیچھے لاکھوں پونڈ کی جائیدادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جب کوئی مصنف مرتا ہے تو وہ یہ چھوڑ جاتا ہے۔ٹوٹی ہوئی چارپائیاں ،غلیظ بستر۔ چند لوٹے اور قرضہ اتنا کہ مرحوم کی سات پشتیں بھی ادا نہ کرسکیں ،اپنے وطن میں ادبا کی شاذ ہی دریا دلی سے تعریف کی جاتی ہے۔اگر وہ کوئی اچھی چیز لکھیں تو یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہیں سے چرائی ہے۔اور اگر چرائی نہیں تو انہوں نے کسی مغربی شاہکار کا ترجمہ کرڈالا ہے۔اور اگر کبھی کبھار مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے واقعی اچھی چیز لکھی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ابھی وہ رذیل قسم کے ادیب ہیں ،جنہیں موپساں اور چیکوف سے دور کی بھی نسبت نہیں ، چاہے وہ کتنا زور ماریں۔ان کی عظمت کا اعتراف ہمیشہ دبی زبان میں کیا جاتا ہے،اور تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ ہنوز دہلی دور است۔

3

اپنے وطن میں تنقید کا بھی عجب معیار ہے۔صرف وہی کتابیں قابل قدر سمجھی جاتی ہیں جن کو ہر شریف آدمی بخوشی اپنی ماں یا بہن کے ہاتھ میں دے سکتا ہے۔یعنی جن میں کوئی اصلاح کا پہلو موجود ہے۔ ہر ایک شاعر اور افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شاعر ،افسانہ نویس اور نولسٹ ہونے سے پہلے پیغمبر ، واعظ اور خطیب ہو۔اس کی ہر کہانی سبق آموز اور ہر نظم نتیجہ خیز ہو۔چنانچہ اگر وہ ناول لکھے ،تو ضرور یہ دکھائے کہ نیک آدمی کو نیکی کی جزا ہر حال میں ملتی ہے۔اور بدمعاش اپنی جرم کی پاداش میں ضرور پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جاتا ہے۔اگر وہ افسانے لکھتا ہے تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ ہندوستانی بیوی اپنے بدکار خاوند کی خباثت کے باوجود اس سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔اگر وہ شاعر ہے تو وہ ہر مذہبی اصول کو اپنی نظم کا موضوع بنائے۔

4

اپنے ملک کی فلمیں بھی عجیب ہیں۔ پندرہ پندرہ ہزار فٹ لمبی۔کہانیوں میں نہ تسلسل نہ پلاٹ، ہر ایک تصویر میں وہی ہیرو وہی ہیروئن۔ایک درجن کے قریب گانے۔ پانچ چھ ناچ۔بوس و کنار کے بغیر محبت۔ بے ربط مکالمے۔ بے معنی گیت ، غیر قدرتی انجام۔ واقعی یہ

عجب ملک ہے جہاں ڈائریکٹر کہانی لکھنے کے علاوہ گانے اور مکالمے بھی خود لکھتا ہے۔ ہیرو کا پارٹ بھی خود ادا کرتا ہے اور دو تین بار ہیروئن سے جھوٹ موٹ بیاہ رچانے کے بعد واقعی اس سے شادی کر لیتا ہے!

5

اپنے وطن میں فحش اشتہارات کی بھی افراط ہے۔ دیواروں، درختوں کے تنوں کے ساتھ، نوٹس بورڈوں پر یہ اشتہار جلی قلم میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی جگہ ان اشتہارات سے بچی ہے تو وہ آسمان ہی ہے۔ ان اشتہاروں کو پڑھ کر ایک غیر ملک کا باشندہ یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہندوستان کا بچہ بچہ جنسی امراض میں مبتلا ہے۔ معزز سے معزز اخبار میں یہ اشتہار نمایاں جگہ پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مگر ہم سب ان سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ ہمارا بڑے سے بڑا ایڈیٹر بھی ان کے برخلاف آواز نہیں اٹھاتا۔

6

اپنے وطن میں ہر اکیلی نوجوان لڑکی یا عورت شک کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے، اگر وہ اکیلی سیر کو جا رہی ہے تو شکار پھانسنے کے لیے جا رہی ہے۔ اگر وہ اکیلی سفر کر رہی ہے تو ضرور حسن فروش ہے۔ اگر وہ تن تنہا سکونت پذیر ہے تو اس پر ہم گھناؤنے سے گھناؤنا الزام لگانے میں حق بجانب ہیں۔ اگر وہ کسی ایسے آدمی سے بات چیت کر رہی ہے، جو اس کا بھائی یا باپ نہیں تو ضرور اس سے اظہار محبت کر رہی ہے۔ اگر شادی نہیں کرنا چاہتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رنگین مزاج ہے۔ اگر وہ اندھیرے میں کہیں جا رہی ہے تو ضرور اپنے عاشق کے گھر جا رہی ہے اور اگر وہ تاریکی میں کہیں سے آ رہی ہے تو اپنے آشنا کے گھر سے آ رہی ہے۔ چونکہ اپنے وطن میں سوائے طوائف کے ہر ایک عورت غلام ہے، اس لیے ہر آزاد خیال عورت پر ہمیں طوائف کا شبہ ہوتا ہے۔

7

واقعی اپنے وطن میں سب کچھ ہے...... نفاق، جہالت، غلاظت، مذہبی جنون۔ ہمارے سٹیشنوں کے مسافر خانے، ہمارے ہوٹل، ریل گاڑیاں، غلاظت سے پر ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے تحمل کا یہ حال ہے کہ ہم سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے مسافر خانے یا ہوٹل میں صرف ایک آدھ گھنٹہ ٹھہرنا ہے۔ اس لیے اگر وہ گندے بھی ہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ہمارے

مذہبی جنون اور جہالت کی یہ حالت ہے کہ ہم جاہل سے جاہل مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کو تیار ہیں۔ وہ جس طرح ہمیں نچاتے ہیں ہم ناچتے ہیں۔ نہ صرف ناچتے ہیں بلکہ ان کے اشاروں پر ناچنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ''کیونکہ مسجد کے سامنے ہندوؤں نے باجا بجایا ہے، اس لیے ہندو وکشتنی ہیں''۔ حالانکہ ابھی ابھی انگریزی پلٹن کا بینڈ قیامت برپا کرتا ہو مسجد کے سامنے سے گزرا تھا۔ ابھی جس وقت مولوی صاحب نہایت انہماک کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے۔ ''کیونکہ اس مسلمان نے گائے ذبح کی ہے، اس لیے اس کی گردن اڑا دو''۔ حالانکہ ہر روز انگریزی چھاؤنیوں میں فوجیوں کے لیے ہزاروں گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ اپنے وطن میں مذہبی پیشوا ہمیشہ مرے ہیں اور مذہب ہمیشہ خطرے میں ہوتا ہے۔ مذہب کی بدولت فرقہ وارانہ فساد کروائے جاتے ہیں۔ تو اسی کی بدولت اور غلامی کی زنجیروں کو مضبوط بنایا جاتا ہے تو وہ بھی اسی کی بدولت۔ عجیب بات یہ ہے کہ متعدد بار زک اٹھانے کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ہمیں الو بنا رہے ہیں۔

8

مگر کہاں تک ذکر کیا جائے کہ اپنے وطن میں کیا کیا ہے۔ اور کیا کیا نہیں۔ اپنے وطن میں سڑکیں ہیں جن پر رات کو کبھی روشنی نہیں ہوتی، اور جن پر دن میں کبھی چھڑکاؤ نہیں ہوتا۔ ایسے جوتشی اور عامل ہیں جنہیں یہ معلوم نہیں کہ آج ہفتے کا کون سا دن ہے مگر جو ہر وقت بتا سکتے ہیں کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ ایسی دکانیں ہیں جو عین بدرو کے اوپر واقع ہیں، مگر جہاں سے اشیاء خریدنے میں کسی کو عذر نہیں۔ ایسے مغرب پرست انسان ہیں جو دروازے اور روشندان بند کر کے اپنی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں، ایسی کم سن بیوائیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاوند کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ ایسے سیاست دان ہیں جن کے نزدیک سیاست دانی کی انتہا چرخہ کاتنے میں ہے...... اینگلو انڈین مصنفوں کی نظر میں ہندوستان، مہاراجوں۔ ہاتھیوں اور سپیروں کا ملک ہے، حالانکہ اچھی طرح دیکھا جائے تو یہ نقالوں، غداروں اور کنگالوں کا وطن ہے۔

اپنے وطن میں محبت گناہ ہے۔ اور عشق جرم۔ مذہب پر جائز اعتراض کرنا کفر ہے اور پرانی روش کو چھوڑنا غداری...... صرف ایک چیز اپنے وطن میں نہیں اور وہ ہے خوبصورت عورتیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے راجوں، نوابوں اور شعرا کو خوبصورت عورتیں لانے کے لیے پیرس اور

لندن جانا پڑتا ہے۔اس چیز کے علاوہ اپنی وطن میں سب کچھ ہے۔ابوالاثر بجافر ماتے ہیں:

اپنے وطن کے دن رات نیارے
باغ اور آکاش، پھول اور ستارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

☆☆☆

فلسفۂ قناعت

ایک انگریز انشاء اللہ پرواز کا قول ہے" چاک کے ٹکڑے سے لے کر خداوند تعالیٰ تک ہر چیز پر مضمون لکھا جاتا ہے"۔میرے دوست اکبر حسین کو اس قول سے اتفاق ہے،ان کی رائے میں نہ صرف ایک چیز پر مضمون لکھا جا سکتا ہے، بلکہ اسے وعظ کا موضوع بھی بنایا جا سکتا ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ اکبر حسین بیک وقت فلسفی اور ناصح واقع ہوئے ہیں۔زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ہو جس کے متعلق انہوں نے غور نہیں کیا،ایک دفعہ مجھے پژمردہ اور اداس دیکھ کر کہنے لگے بھئی ہر وقت یوں بجھے ہوئے سے نظر آتے ہو جیسے ابھی کسی عزیز کو دفنا کر آ رہے ہو۔کبھی تو مسکرایا کرو۔آخر ایسی پژمردگی بھی کیا۔سنا نہیں تم نے وہ مشہور امریکن فلاسفر کا قول کہ" جو شخص قہقہہ لگا کر ہنس نہیں سکتا،اسے تپ دق ہے یا گٹھیا"۔

"مسرت کا راز ہے قناعت،تم نے وہ کہانی تو سنی ہو گی ایک دفعہ شیخ سعدی کے پاس جوتا نہیں تھا"۔

عموماً میں اکبر حسین کی باتیں مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظرانداز کر دیتا ہوں۔لیکن ان کے فلسفہ قناعت میں کچھ ایسی خوبی نظر آئی کہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔اب جس قدر اس فلسفے پر عمل کرتا ہوں اس کی صداقت مجھ پر روشن ہوتی جاتی ہے۔پہلے جب کبھی میں اپنا منہ آئینہ میں دیکھتا تو اسے زمین پر پٹک دیتا۔لیکن اب جو اس میں اپنی شکل دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔چہرہ برا سہی لیکن اس لنگور سے بدرجہا بہتر ہے جسے میں نے چڑیا گھر کے پنجرے میں دیکھا تھا۔خدا قادر مطلق ہے،اگر چاہتا تو مجھے لنگور بنا دیتا۔گو اب بھی اس میں بہت تھوڑی کسر اٹھا رکھی ہے۔مگر

الحمد للہ کہ بالکل لنگور نہیں بنایا۔ پہلے میں اپنا موازنہ لارڈ بائرن اور کلارک گیبل سے کیا کرتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اتنی کوفت ہوتی تھی کہ اپنا چہرہ نوچ لینے کو جی چاہتا۔ مگر اب میں اپنا موازنہ حبشیوں اور شاعروں سے کرتا ہوں اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ مجھ سے بدصورت انسان بھی دنیا میں بستے ہیں۔ پہلے جب میری بیوی بدمزہ کھانا تیار کر کے میرے آگے رکھتی، تو میں جل بھن کر کباب ہو جاتا۔ اب اسے زہر مار کرنے کی بجائے نہایت رغبت سے کھاتا ہوں۔ کھانا لاکھ برا سہی، مگر اس کھانے سے اچھا ہے جو سنٹرل جیل میں ''سی'' کلاس کے قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔ سالن میں نمک زیادہ سہی۔ لیکن اگر میری بیوی چاہتی تو سارا نمک دان سالن میں انڈیل سکتی تھی۔

اس طرح جب میرے پاس پہننے کو کوٹ نہیں ہوتا تو میں اس بات ہی سے مسرت حاصل کرتا ہوں کہ میرے پاس قمیص تو ہے۔ اگر قمیص پھٹ جاتی تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ بنیان تو ہے۔ پچھلی سردیوں میں میرے پاس رضائی نہیں تھی لیکن میں ذرا پریشان نہ ہوا۔ میں نے سوچا ہزاروں گیدڑ ہر رات سردی میں ٹھٹھرتے ہیں اور شور مچا مچا کر لوگوں کی نیند خراب کرتے ہیں۔ میں ان گیدڑوں سے تو اچھا ہوں، میرے پاس رضائی نہیں لیکن میں لوگوں کی نیند حرام تو نہیں کرتا۔

اکبر حسین کے فلسفے میں وصف یہ ہے کہ آپ کو ہمیشہ کوئی ایسا بدنصیب ضرور مل جائے گا جس کو دیکھ کر آپ اپنا رنج بھول سکیں اور بالفرض محال، اگر کوئی ایسا انسان نہ ملے تو آپ جانوروں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، آوارہ کتوں کو دیکھئے، بیچارے کس طرح مارے مارے پھرتے ہیں، چوہوں کو لیجئے، کتنے حقیر اور بے سروسامان نظر آتے ہیں۔ نکتہ اس فلسفے میں یہ ہے کہ آپ موازنہ کرتے وقت صحیح قسم کے شخص یا جانور کا انتخاب کریں، اگر آپ کا انتخاب صحیح ہوگا تو تمام ارضی وسماوی آفات آپ کو ہیچ نظر آئیں گی۔ مثلاً آپ کو کالی کھانسی کی شکایت ہے، کھانستے کھانستے دم پھول جاتا ہے، آپ سخت مصیبت میں مبتلا ہیں، پھر بھی آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو صرف کالی کھانسی کی شکایت ہے، تپ دق نہیں۔ اور اگر آپ کو کچھ عرصہ کے بعد تپ دق ہو جائے تو پھر قبرستان کا تصور ذہن میں لایئے بلکہ اگر ہو سکے تو قبرستان کی طرف نکل جایئے اور قبروں میں سوئے ہوئے مردوں سے پکار پکار کر کہیے۔ مجھے تپ دق ضرور ہے، میں صبح

وشام خون تھوکتا ہوں، مگر میں تم سب سے بدرجہا اچھا ہوں، میں ابھی چل پھر سکتا ہوں، ابھی میں زندہ ہوں۔ اس طرح گھر میں بوریا نہ ہو تو یوں دل کو بہلایئے کہ غریب خانہ، یتیم خانے سے بہتر ہے اور اگر بیوی حسین نہ ہو تو اس کا موازنہ اپنے ہمسائے کی خوبصورت بیوی سے مت کیجئے، بلکہ بدصورت مہترانی سے، اور اگر بدقسمتی سے مہترانی بھی بیوی سے حسین ہو تو چڑیل کے ساتھ، آخر کوئی تو ایسی عورت ہوگی جس سے آپ کی بیوی کم بدصورت ہے، پھر آپ کیوں دل میلا کرتے ہیں۔ اگر آپ کی تنخواہ کم ہے، آپ کی اولاد بدتمیز ہے، آپ کی صحت کمزور ہے تو کیا غم ہے۔ آپ سے کم تنخواہ پانے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور دنیا میں ایسے بدتمیز لڑکے ہیں جن کے مقابلہ میں آپ کے بچے تو عین شریف زادے ہیں۔ اور کمزور انسان! ذرا گردوپیش نظر ڈالئے، آپ کو ایسے مریل انسان ملیں گے جن کے مقابلہ میں آپ رستم زماں ہیں۔

بھئی آپ کچھ ہی کہیں، اکبر حسین کا فلسفہ ہے بڑے مزے کی چیز، صرف اتنی احتیاط کیجئے کہ اپنا موازنہ اشوک کمار یا سیٹھ گھنشیام داس برلا سے نہ کر بیٹھے ورنہ ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ ہاں اگر آپ واقعی مسرت کے طالب ہیں تو اپنے مقابلہ اس یتیم لڑکے سے کیجئے جسے تین دن سے روٹی نصیب نہیں ہوئی، اس لنگور سے جو چڑیا گھر کے آہنی پنجرے میں بند ہے اور جسے دیکھ کر میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں، کہ خدا نے مجھے لنگور نہیں بنایا۔

☆☆☆

کامریڈ شیخ چلی

ایک روز قبرستان سے میرا گزر ہوا، ایک قبر بہت پسند آئی، اس کے قریب گیا اور سرمزار کھڑا ہو کر قبر کے ثبات پر غور کرنے لگا۔ معاً نظر لوحِ تربت پر پڑی لکھا تھا۔ ''شیخ چلی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار'' آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ہاتھ بے اختیار فاتحہ پڑھنے کو اٹھے۔ آہ شیخ چلی برِ صغیر کا سب سے بڑا مفکر، تو ہمارے یہاں سے کیا گیا، خیالی پلاؤ پکانے کا سلسلہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ پلاؤ پہلے ہی ہمارے یہاں کم ملتا ہے، مگر اب خیالی پلاؤ سے بھی محروم ہو گئے۔

یک لخت مزار سے صدا آئی، راہی۔ تم غلطی کر رہے ہو، شیخ چلی ابھی زندہ ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ میں نے حیران ہو کر کہا۔ شیخ چلی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ظالم! قبر میں لیٹ کر بھی

خیالی پلاؤ پکانے سے باز نہیں آتے۔ شیخ چلی نے جواب دیا۔ شیخ چلی ہر شخص کے دماغ میں رہتا ہے۔ اگر تم اپنی دل ودماغ کا جائزہ لو ضرور مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپا ہوا پاؤ گے۔

میں نے مسکرا کر کہا "شیخ صاحب آپ استعاروں میں گفتگو کرنے لگے، میں تو آپ کو دنیائے آب وگل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اپنے دل کے گوشے میں نہیں بلکہ جسدِ خاکی میں دیکھنے کا خواہش مند ہوں"۔

شیخ چلی نے چلا کر کہا۔ "یہ کوئی مشکل بات نہیں، کیا تم مجھے آج شام مال روڈ کے قہوے خانے کے باہر مل سکتے ہو"۔ میں نے جواب دیا۔ "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی"۔ شیخ چلی سے رخصت ہو کر میں گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں شیخ چلی کے اس فقرے پر غور کرتا رہا کہ شیخ چلی ہر شخص کے دماغ میں رہتا ہے۔ اچانک مجھے اپنا ایک شاعر ایک دوست یاد آیا جو اکثر اپنے مستقبل کے متعلق اس قسم کے ہوائی قلعے بناتا ہے کہ میری شاعری آج سے ایک ہزار برس بعد کی شاعری ہے، اس لیے ہندوستان میں اسے صرف دو تین آدمی، سمجھ سکتے ہیں۔ اور جب میرا باتصویر دیوان آرٹ پیپر پر شائع ہوگا تو لوگ بال جبریل اور مرقع چغتائی کو بھدل جائیں گے اور معاً مجھے اس فلسفی کا خیال آیا جو مجھے دہلی میں ملا تھا اور جس نے کہا تھا کہ میں نے اپنی کتاب میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی اس خوبی سے تردید کی ہے کہ نوبل پرائز کمیٹی کے ممبر حیران رہ جائیں گے۔ اس قبیل کا میرا ایک اور دوست تھا۔ پنڈت شرما۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی شرما نجلی کے مقابلہ میں ٹیگور کی گیتا نجلی کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا اور خود میں نے کتنی دفعہ عجیب و غریب خیالی پلاؤ پکائے ہیں۔ کبھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سارے یورپ کی سیر کر ڈالی تو کبھی گھاس پر لیٹے لیٹے آسمان کے تارے توڑ لایا۔ شیخ چلی سچ کہتا تھا۔ ہم سب شیخ چلی ہیں۔ اچانک میں نے اپنے آپ کو مال روڈ کے قہوہ خانے کے دروازے پر کھڑا پایا۔ دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان اپنے قد سے چار گنا لمبا جھنڈا الثائے غلیظ گاڑھے کا لباس پہنے دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ چہرہ دھوپ سے جُھلسا ہوا، روکھے سوکھے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے، آنکھیں لال لال اور ڈراؤنی، گال پچکے ہوئے، مجھے دیکھتے ہی مسکرایا جیسے مجھ سے جان پہچان ہو۔ میں نے جونہی اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے انگلی سے اپنی کشتی نما ٹوپی کی طرف اشارہ کیا جس پر سرخ روشنائی سے لکھا ہوا تھا "کامریڈ شیخ چلی"۔ دوسرے لمحے وہ مجھ سے بغل گیر ہو رہا تھا "آیئے قہوہ

پیجیئے'' اس نے مجھے مدعو کرتے ہوئے کہا، ہم دونوں قہوہ خانے میں داخل ہو گئے۔

''تو آپ کی خواہش پوری ہوگئی'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا مذاق ہے'' میں نے ترشروئی سے کہا۔ ''یہ کیا سوانگ بنا رکھا ہے آپ نے''۔

''گھبرائیے نہیں'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''شیخ چلی کو اشتراکی کے بھیس میں دیکھئے''۔

''اچھا تو اب یہ سودا سمایا ہے۔ کیا ارادے ہیں اب کی بار۔ قصوں کی کہانیوں میں تو مشہور ہے کہ آپ کی سب سے بڑی خواہش وزیر کی لڑکی سے شادی کرنا تھی، اب کیا خیال ہے''۔

وزیر کی لڑکی سے شادی کرنے کا خیال بورژوا خیال ہے۔ اب میں اس قسم کے فضول خیالات سے سخت نفرت کرتا ہوں۔''

''بورژوا! اجی شیخ صاحب، یہ بورژوا کیا ہے''؟

''عجب احمق ہو تم'' شیخ چلی نے بگڑ کر کہا۔ ''اتنا بھی معلوم نہیں ابھی تم پوچھو گے کہ پرولتاری کا کیا مطلب ہے۔''

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے پرولتاری کے معنی بھی نہیں آتے۔''

''تب تم نرے گاؤدی ہو۔ دیکھو دنیا کی ہر چیز بورژوا ہے یا پرولتاری مگران دونوں میں کیا فرق ہے!''

''فرق! فرق یہ ہے کہ جو چیز بورژوا نہیں وہ پرولتاری ہے اور جو پرولتاری نہیں وہ بورژوا ہے''۔

''واہ کیا تشریح فرمائی آپ نے۔''

''بھائی یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ دنیا کی ہر نفیس، ملائم، شفاف چیز بورژوا ہے اور ہر غلیظ، سخت اور بدصورت پرولتاری۔''

''مثلاً''

''مثلاً یہ کہ پھول بورژوا ہے ہے، کانٹا پرولتاری، کھانڈ بورژوا ہے گڑ پرولتاری ریشم بورژوا ہے گاڑھا پرولتاری۔''

''اچھا تو قہوے کے متعلق کیا خیال ہے۔'' میں نے میز پر رکھے ہوئے قہوے کے پیالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''قہوہ خانہ پرولتاری ہے۔ دیکھئے اس طرح ہے کہ شراب بورژوا ہے اور چائے پرولتاری

چائے سے زیادہ قہوہ پرولتاری، ہے کیونکہ سنا ہے اور قہوہ سے زیادہ پرولتاری میونسپلٹی نل کا پانی ہے کیونکہ بالکل مفت ملتا ہے۔''

''واللہ تم خوب سمجھے'' شیخ چلی نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''خیر یہ تو ہوا شیخ صاحب یہ فرمائیے کہ، آپ کے منصوبے کیا ہیں۔''

''میرے منصوبے؟'' شیخ نے فخر سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔'' میرے منصوبے میں ہندوستان سے بورژوا تہذیب، بورژوا ذہنیت، بورژوا تمدن کا قلع قمع کرنا۔''

''وہ کس طرح، قہوے کے پیالے پی پی کر؟''

''جی نہیں'' شیخ نے ذرا تنک کر کہا ''خون کے دریا بہا کر''۔

''خون کے دریا؟''

''جی ہاں خون کے دریا، بھی مستقبل قریب میں یہاں خون کے دریا بہیں گے۔''

''میرے اللہ'' میں نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔''تو آپ لوگوں کا خون کریں گے۔ کیا میں پولیس کو خبر دوں''

''ہاں ہاں ہزاروں کا خون، لاکھوں کا خون اور اگر ضرورت پڑی تو کروڑوں کا خون۔''

''اس سے فائدہ؟''

''اس سے فائدہ یہ کہ اس کمبخت سرزمین کے گناہ جسے تم ہندوستان کے نام سے پکارتے ہو تب تک نہیں دھل سکتے جب تک یہاں خون کی ندیاں نہ بہائی جائیں۔''

''کس کس کا خون کریں گے آپ؟۔''

''ہاں ہاں سب سے پہلے'' میں نے گبھرا کر پوچھا۔

''سب سے پہلے بوڑھے لیڈروں کا۔''

''اس کے بعد؟''

''بزدلوں اور غداروں کا۔''

''اس کے بعد؟۔''

''ملاوں اور پنڈتوں کا''

''مگر شیخ صاحب ان بیچارے بوڑھے لیڈروں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟''

''یہی تو آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ سٹھیائے ہوئے کھوسٹ، یہ مہاتما، یہ پنڈت، یہ مولانا، یہ بزدل لیڈر جنہیں خون سے ڈر لگتا ہے اور جو خون کے بجائے ہندوستان میں شہد اور دودھ کی نہریں بہانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کٹھ پتلیاں ہیں جو سرمایہ داروں کے اشاروں پر ناچ رہی ہیں۔''

''تو آپ کا مقصد ان سے لیڈر شپ چھیننا ہے۔''

''ہاں، مگر ذاتی اغراض کے لیے نہیں بلکہ قومی مفاد کے لیے۔''

''مگر کیا ان کی لیڈر شپ اور آپ کی لیڈر شپ میں فرق ہوگا۔''

''زمین و آسمان کا فرق دیکھئے سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ وہ اوپر سے نیچے کی طرف انقلاب لانا چاہتے ہیں اور ہم نیچے سے اوپر کی طرف انقلاب لے جاتے ہیں۔''

''اس اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کا مطلب؟''

''یار تم بھی گاؤدی ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ نیچے سے مطلب ''جنتا'' ہے اور اوپر سے مطلب سرمایہ دار۔''

''جنتا یعنی؟''

''جنتا یعنی عوام یعنی عامتہ الناس۔ یعنی ہم تم۔''

''مگر شیخ صاحب جنتا تو ان پڑھ ہے، جاہل ہے۔ توہمات میں پھنسی ہوئی ہے۔ ڈرپوک ہے۔''

''یہ صحیح ہے مگر کامریڈ لینن کہتا ہے کہ جنتا ہمیشہ اپنی ہوتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں اگر ادھر جنتا کمزور ہے تو ادھر ہماری اشتراکی پارٹی مضبوط ہے۔ پارٹی کی طاقت ہر روز بڑھ رہی ہے اور اب تو اس کے ارکان میں نصف سے کچھ ذرا کم عورتیں بھی ہیں۔ یہ اس کی مضبوطی کا ایک اور ثبوت ہے اور ہاں تم سن کر خوش ہو گے کہ پارٹی کا اپنا اخبار بھی ہے جس کی اشاعت تین سو کے قریب جا پہنچی ہے اور اگر پارٹی کے ممبر اسی تن دہی کے ساتھ چوراہوں پر کھڑے ہو کر اسے بیچتے رہے تو شاید اس کی اشاعت چار سو بھی ہو جائے۔''

''مگر آپ جنتا کے لیے کیا کر رہے ہیں؟''

''اجی صاحب یہ سب کچھ جنتا کے لیے ہی تو ہے۔ دیکھئے ہم سال میں ایک بار دیہات میں کیمپ لگاتے ہیں۔ جی کڑا کر کے سرسوں کا ساگ اور مکی کی روٹی بھی کھاتے ہیں۔ کسانوں کی

بولی سمجھنے اور انہیں اپنے خیالات سمجھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور جب باوجود کوشش کے ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے تو واپس آ جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''اچھا تو آپ کے خیال میں انقلاب آپ کی پارٹی لائے گی یا جنتا؟''

''دونوں۔ دیکھئے اشتراکی پارٹی دن بدن زور پکڑ رہی ہے۔ گو آج اس کے تعداد دو چار سو آدمیوں سے زیادہ نہیں، مگر اگلے سال اس کی تعداد ایک ہزار ہو جائے گی، اور اس سے اگلے سال پانچ ہزار اور اس سے اگلے سال بیس ہزار، یہاں تک کہ اس کی تعداد تین کروڑ، دنیا کی سب سے بڑی پولیٹکل پارٹی! آہستہ آہستہ یہ پارٹی میونسپل ایکشن لڑنا شروع کرے گی۔ اس کے بعد اسمبلی کے لیے امیدوار کھڑی کرے گی۔ کونسلوں پر قبضہ کرتے ہی یہ سرخ فوج تیار کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لے گی۔ آہ کامریڈ! وہ دن کتنا مبارک ہوگا جب ہماری پارٹی ایک کروڑ نوجوانوں کی فوج تیار کر کے سرمایہ داری کے قلعہ پر ہلہ بول دے گی۔''

''مگر اس فوج میں آپ کی حیثیت کیا ہوگی؟''

''میری حیثیت'' شیخ نے طمطراق کے ساتھ کہا۔ ''یقیناً میری حیثیت سپہ سالار کی ہو گی۔ میں ہندوستان کا لیٹن بنوں گا، میرے ادنیٰ سے اشارے پر لاکھوں سرمایہ داروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ہزاروں نوابوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ لاکھوں جاگیرداروں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے گا۔ میں حکم دوں گا ''فائر! اور کروڑوں غداروں کے سر ہوا میں آڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''اس کے بعد انقلاب پرانے نظام کے پرخچے اڑیں گے۔ سرخ جھنڈا لہرائے گا، سرخ اندھی چلے گی، کوئی جاگیردار ہوگا نہ نواب، رائے بہادر نہ خان صاحب، بڑی توندوں والے سیٹھ نہ بھونڈی شکل والے سرمایہ دار، مسجد نہ مندر، ملا نہ پنڈت بس جنتا ہوگی جنتا، مساوات، ہر ایک شخص کام کرے ہر ایک شخص آرام کرے، اور ہر شخص کو طعام ملے گا۔

''اور بلفرض'' میں نے جرات کر کے پوچھا ''شیخ صاحب اگر اس وقت کوئی نواب یا سرمایہ دار آپ کے پاس جان بخشی کی درخواست لے کر آئے تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

میں اس سالے کو اس زور سے لات ماروں گا کہ اس کی بتیسی باہر آ پڑے گی، اور یہ کہتے ہی

شیخ صاحب نے زور سے دولتی چلائی تو سامنے رکھی ہوئی میز اور اس پر پڑے ہوئے قہوے کے پیالے دس گز کے فاصلے پر جا رہے۔ گرم گرم قہوے کے چھینٹے اڑ کر چار پانچ شریف قہوہ نوشوں کے چہروں اور کپڑوں پر جو گرے تو قہوہ خانے میں ہلڑ سا مچ گیا۔ کسی نے کہا سو [illegible] ہے۔ کسی نے کہا دیوانہ ہے۔ تمام لوگ ہماری طرف بھاگتے دکھائی دیے۔ شیخ چلی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ کونے میں سے اپنا جھنڈا اٹھایا، چوکڑی بھری اور ہوا ہو گئے۔ اب جنتا ان کا تعاقب کر رہی تھی اور میں جنتا سے چلا چلا کر کہہ رہا تھا، ارے لوٹ آؤ، کیوں مفت میں پاؤں تھکاتے ہو، یہ تو کامریڈ شیخ چلی ہے۔

☆☆☆

فلمی شاہکار

آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ ابھی ابھی ایک مشہور فلم کمپنی کے ڈائرکٹر نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس کی تازہ ترین فلم کے لیے کہانی لکھوں۔ شرائط یہ ہیں (1) پلاٹ طبعزاد ہو (2) عوام اسے پسند کریں۔ جہاں تک دوسری شرط کا تعلق ہے اسے پورا کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ عوام کیا پسند کرتے ہیں۔ چند خوبصورت لڑکیاں (اگر نیم برہنہ ہوں تو سبحان اللہ) دس بارہ گانے، چار پانچ ناچ اور آخر میں ہیرو اور ہیروئن کی شادی، یہ ہے عوام کا مطالبہ اور اگر اس مرکب میں بھونڈے مذاق کا عنصر بھی شامل کر دیا جائے تو کیا کہنے۔ بلاشبہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلم نیا ریکارڈ قائم کرے گی مگر پہلی شرط کو پورا کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ تاہم کوشش کرتا ہوں۔

میرے خیال میں اب لوگ ایسی فلموں سے تنگ آ گئے ہیں جن کا پلاٹ ''محبت کی ازلی تکون'' پر مبنی ہوتا ہے۔ دو مرد ایک عورت۔ دو عورتیں ایک مرد۔ یقیناً یہ داستان متعدد بار دہرائی جا چکی ہے کیوں نہ ایسی کہانی لکھی جائے جس کا پلاٹ محبت کی کثیر الاضلاع پر مبنی ہو۔ مثلاً بیس اشخاص منتخب کیے جائیں، دس آدمی۔ دس عورتیں اور پھر ان کو ایک دوسرے سے اس طرح عشق کرتے ہوئے دکھایا جائے کہ اگر رمیش کو لیلا سے محبت ہے تو لیلا سریش پر فریفتہ ہے تو کملا سریندر پر دل و جان سے فدا ہے۔ سرمیش سریندر سے عشق ہے تو سروج مہندر کے دامِ الفت و محبت کا دم بھرتا

ہے۔ گرفتا راؤ بے چارہ مہندر مدت سے شیلا کے تیر نظر کا شکار ہو چکا ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس۔ اس زنجیر کے حلقے پھیلتے جائیں، خاتمے سے پہلے آدھے افراد خودکشی کر لیں اور باقی ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کے بعد جیل خانے پہنچ جائیں۔ کہانی کا پس منظر ہو، ایسا کالج جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے، اور کرداروں میں طالب علموں کے علاوہ دو چار پروفیسر بھی شامل کیے جائیں تاکہ قصہ ناقابل یقین اور غیر دلچسپ معلوم نہ ہو۔ خودکشی کرنے والے حضرات اگر کالج کے کلاک ٹاور سے چھلانگیں لگائیں تو بہتر رہے گا۔ یہ اس لیے کہ باقی طالب علم ان کی جرات رندانہ یا لغزش مستانہ کی داد دے سکیں۔

میری دانست میں یہ پلاٹ طبع زاد ہے۔ کم از کم میں نے تو آج تک اس قسم کا پلاٹ اسکرین پر نہیں دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے ڈائرکٹر ''محبت کی مستطیل، تک پہنچے ہیں''۔ مگر ''محبت کی کثیر الاضلاع'' کے مقابلے میں ''محبت کی...... مستطیل'' کی کیا وقعت ہے۔ اس پلاٹ میں البتہ ایک نقص ہے اور وہ یہ ہے اسے فلمانے کے لیے کم از کم بیس فلم اسٹاروں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی اور ہمارے یہاں بیس فلم اسٹاروں کا بوجھ اٹھانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے، اس لیے بات نہیں بنے گی۔

اچھا تو کیوں نہ ایسا پلاٹ ایجاد کیا جائے جو نفرت کی تکون پر مبنی ہو۔ مثلاً مسٹر الف کو مس ب سے نگاہیں اولین میں نفرت ہو جاتی ہے۔ شاید بیچاری کا رنگ کالا ہے یا ناک چپٹی۔ مس ب بھی نفرت کا جواب نفرت میں دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ نفرت پروان چڑھنے لگتی ہے، پہلے وہ دونوں جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو منہ پھیر لیتے تھے۔ اب ایک دوسرے کو زیر لب گالیاں دیتے ہیں اور کچھ عرصے بعد تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ مس ب کو مسٹر الف کا نام سن کر متلی ہونے لگتی ہے۔ اس اثناء میں ایک رقیب مسٹر ج، مسٹر الف کی راہ میں حائل ہوتا ہے، یہ شخص مس ب سے مسٹر الف سے بھی زیادہ نفرت کرتا ہے۔

اس کے بعد 'الف' اور 'ج' کی لڑائی دکھائی جا سکتی ہے۔ بہت سی کرسیاں اور چند آئینے توڑے جا سکتے ہیں۔ ج کو جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل، کمرۂ عدالت کا مقبول سین بھی دکھایا جا سکتا ہے اور آخر میں اگر فلم کو المیہ بنانا منظور ہو تو 'الف' اور 'ب' کی شادی۔ اگر طربیہ تو 'الف' اور 'ب' کی دائمی مفارقت۔

پلاٹ اچھا ہے۔ لیکن قیاس غالب ہے کہ کہانی مقبول عام نہیں ہوگی۔ کیونکہ عوام سکرین پہ صرف محبت کے سین دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایسا پلاٹ ایجاد کروں جو سنسنی خیز اسٹنٹوں سے بھرپور ہو۔ سٹنٹ فلم تجارتی نقطہ سے نظر ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ نام ہو ''ڈاکو کا بیٹا'' عرف ''قاتل کا قاتل'' اور سٹنٹ ہوں ایسے کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ایک ڈاکو اپنے باپ کے قاتل کو قتل کرنے کی بعد پولیس کے خوف سے مکان کی ساتویں منزل سے اس طرح بھاگتی ہوئی ٹریم سے کود کر نہایت صفائی سے یکے میں آ گرے۔ یکے سے پھدک کر یکے میں جتے ہوئے گھوڑے پر جا بیٹھے اور گھوڑے سے اچھل کر جھیل میں جا پڑے۔ جب تیرتے تیرتے تھک جائے تو جھیل سے باہر نکل کر کسی اجنبی کی موٹر سائیکل پر سوار ہو جائے اور ایک سو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کسی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دے۔ اس اثنا میں چالاک پولیس افسر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ڈاکو کا تعاقب کرے، اور ہوائی چھتری کی مدد سے دھم سے موٹر سائیکل کی سائیڈ کار میں آن گرے اور جھٹ پستول نکال کر کہے ''ہینڈز اپ'' وغیرہ وغیرہ۔

یہ پلاٹ مقبول عام تو ہو سکتا ہے، مگر شاید طبع زاد نہیں۔ اس میں اگر کوئی جدت ہے تو صرف یہی کہ پولیس افسر کو ہوائی چھتری کی مدد سے اترتے دکھایا گیا ہے۔

ذرا ٹھہریئے۔ کیوں نہ ایسی کہانی لکھی جائے جو کسی سنت اوتار یا سادھو کی زندگی کے متعلق ہو۔ جیسے ''سنت طوطا رام'' ''سوامی بھوت ناتھ بھگت ٹوپن داس'' کم از کم عورتیں اور بوڑھے آدمی تو ایسی فلم کو بے حد پسند کریں گے۔

سنت طوطا رام کو لنگوٹا بندھوا کر کسی بڑھ یا پیپل کے درخت کے نیچے بٹھا دیا جائے۔ چار پانچ منٹ سمادھی لگانے کے بعد وہ ایک لمبے چوڑے گرنتھ سے جو کاغذ کی بجائے پیپل کے پتوں پر لکھا گیا ہے، چند نہایت عامیانہ فہم کی باتیں ترنم کے ساتھ لوگوں کو پڑھ کر سنائیں، جیسے مرنے کے لیے ہر وقت تیار رہو، بلکہ ہو سکے تو زندہ رہنے کی کوشش ہی مت کرو۔ اپنے ہمسائے کی بیوی کو اپنی بہن سمجھو، جانوروں پر رحم کھاؤ، پیاز مت کھاؤ، اس کے بعد سنت جی دو ایک معجزے دکھائیں۔ مثلاً ایسا منتر پڑھیں کہ ان کے تمام دشمن اندھے ہو جائیں یا اس قسم کا فلک شگاف نعرہ بلند

کریں کہ ہر ایک گھر کو آگ لگ جائے، ریت سے پھول اگنے لگیں، لوگ پاگل ہو جائیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک سنت جی کے مخالف راہ راست پر نہیں آتے، یعنی ان کا لوہا نہیں مانتے۔ اس کے بعد سنت جی کی موت کا سین دکھایا جائے۔ سنت جی دم توڑنے کے بعد ہوا میں اڑتے ہوئے نظر آئیں، ہو سکے تو ان کے لیے عرش بریں سے کوئی رتھ یا اڑن کھٹولا بھی بھیجا جائے۔ جب آپ اڑن کھٹولے میں اطمینان کے ساتھ سوار ہو جائیں تو ان پر پھولوں کی بارش کی جائے۔

میری رائے میں یہ پلاٹ ڈائرکٹر صاحب ضرور پسند فرمائیں گے۔ یقیناً وہ طبعزاد نہیں لیکن اس میں قبولیت عامہ حاصل کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور دراصل ڈائرکٹر لوگ چاہتے بھی یہی ہیں۔ سنت طوطا رام کے نام ہی میں وہ کشش ہے کہ لوگ کھنچے چلے آئیں گے اور پھر جب ان کے معجزے سکرین پر دکھائے جائیں گے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھے گا مگر سب سے بڑی خوبی اس پلاٹ میں یہ ہے کہ یہ فلم ہر ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکے گا اور اگر بہن اپنے بھائی کی معیت میں اس سے لطف اندوز ہونا چاہے گی تو بھائی کو شرم سے گردن جھکانا نہیں پڑے گی۔

لیجئے صاحب تو ڈائریکٹر الف زیڈ کامرانی کی تازہ فلم کے لیے کہانی تیار ہو گئی۔ عنقریب اپنے شہر کی دیواروں پر یہ پوسٹر پڑھیے گا۔ ''ڈائریکٹر کامرانی کا نیا شاہکار، سنت طوطا رام...... کہانی کے ایل کپور...... مکالمے ماسٹر ہدہد''۔

☆☆☆

تعاقب

آج کل ایک شخص نہایت مستعدی سے میرا تعاقب کر رہا ہے۔ کافی ہاؤس میں، سرراہ، کسی محفل میں۔ ہاں کہیں میرا اس کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ وہ چھوٹتے ہی مجھ سے ایک سوال کرتا ہے۔ ''صاحب! آپ کو پریم چند کا کون سا ناول پسند ہے؟'' بظاہر سیدھا سادا سوال ہے جس کا جواب دینا مشکل نہیں۔ لیکن جس شخص نے پریم چند کا کوئی ناول نہ پڑھا ہو اس کے لیے کچھ اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے دنوں پریم چند کی دوسری برسی کے موقع پر میں نے

ایک مقالہ پڑھا تھا۔عنوان تھا۔''پریم چند بحیثیت ناولسٹ'' یہ مقالہ بے حد سراہا گیا۔صاحب صدر نے تو یہاں کہہ دیا کہ پریم چند پر ایسا پر مغز مقالہ اردو زبان میں لکھا گیا ہے نہ لکھا جائے گا۔اور بہت حد تک۔گو غیر شعوری طور پر سہی۔صاحب صدر حق بجانب تھے کیونکہ میں نے سارے کا سارا مقالہ انگریزی کتاب سے جو کسی جدید نقاد نے اوہنری (O.Henry) پر لکھی تھی، چرایا تھا۔البتہ اس میں تھوڑا سا ردوبدل کر دیا تھا۔یعنی جہاں جہاں اوہنری کا نام آتا تھا۔وہاں ''پریم چند'' لکھ دیا تھا۔اس جلسہ کے اختتام پر یہ شخص مجھے ملا اور مجھے مبارک باد دینے کے بعد اس نے کہا۔''میں پچھلے پندرہ برس سے پریم چند پر ایک کتاب لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں میں اس موضوع پر آپ سے مفصل بحث کرنا چاہتا ہوں''۔رسمی طور پر میں نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا''بڑے شوق سے۔آپ کبھی غریب خانہ پر تشریف لے آئیے''۔لیکن جب کچھ دنوں کے بعد وہ میرے مکان پر آدھمکا،تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پریم چند کا کوئی ناول شروع سے آخر تک نہیں پڑھا،کسی کا دیباچہ دیکھا ہے،کسی کا پہلا باب پڑھا ہے،کسی کا آخری۔خیر اس دن تو میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے آج زکام ہے اور جب زکام ہو تو اچھی چیز بھی بری لگتی ہے، چاہے وہ پریم چند کی کہانی ہی کیوں نہ ہو۔لیکن جب اتوار کے دن وہ پھر نمودار ہوا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔میں نے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔پوچھا''آپ کو ولائتی شلغم پسند ہیں یا دیسی،آپ کو پتنگ بازی سے شغف ہے یا بیٹر بازی سے،آپ کی پتلون نئی ہے یا سیکنڈ ہینڈ؟لیکن وہ کم بخت ہر تیسرے منٹ کے بعد اپنا سوال دہرا دیتا۔''آپ نے نہیں بتایا کہ آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے؟''آخر ایک دفعہ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔''مجھے پریم چند کے تمام ناول پسند ہیں''۔اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔یہ کیسے ہو سکتا ہے۔آخر تمام ناول شاہکار تو نہیں ہو سکتے۔''میں نے سنجیدگی سے کہا۔''تو آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے خیال میں پریم چند کا کونسا ناول شاہکار کا درجہ رکھتا ہے''۔اس نے اثبات میں سر ہلایا۔میں نے آہستہ سے کہا۔''چوگان ہستی''۔فرمانے لگے۔''کیوں پسند ہے؟''میں نے چہرے پر متانت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔''دیکھئے یہ ناول سب شریف آدمیوں کو پسند ہے،ممکن ہے،آپ کو پسند نہ ہو۔لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے بھی اچھا نہ لگے''۔

''چھوڑیئے اس بات کو''۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بتایئے کہ اس ناول میں آپ کو کون سا کردار پسند ہے؟''

''ہیرو کا''۔

''ہیرو کے علاوہ؟''

''ہیروئن کا''۔

''ہیروئن کے علاوہ؟''۔

''ہیروئن کے علاوہ مجھے کوئی کردار پسند نہیں''۔

''وجہ؟''۔

''وجہ یہ ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ جتنے کردار ہیں، میں انہیں کردار ہی نہیں سمجھتا''۔

''آپ انہیں کیا سمجھتے ہیں؟''۔

''گھسیارے''۔

خوش قسمتی سے اس موقع پر ایک دوست تشریف لے آئے اور میں نے ان سے معذرت چاہی۔ چند دن آرام سے گزرے۔ اس کے بعد وہ تشریف لے آئے۔ اور کہنے لگے۔ ''اس دن آپ کے جوابات کچھ اس قدر مبہم اور غیر واضح تھے کہ میری تسلی نہیں ہوئی۔ آج مجھے تفصیلاً بتایئے کہ آپ ''چوگان ہستی'' کو کیوں شاہکار تسلیم کرتے ہیں''۔

میں نے چوگان ہستی کی شان میں چند رسمی تعریفی کلمات کہے۔ ''دیکھئے اس ناول میں پریم چند نے زندگی کی عکاسی کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ شیکسپیئر سے بھی بلند نظر آتا ہے۔ کردار سازی میں وہ فیلڈنگ، سکاٹ، جیمز جائس سے بھی بازی لے گیا ہے۔ اسلوب بیان میں وہ ہمیں ٹامس ہارڈی میریڈتھ اور ورجینیا ولف کی یاد دلاتا ہے۔ دو ایک ابواب میں اس نے چارلس ڈکنز، تھیکرے، موپساں اور میکسم گورکی سے ٹکر لی ہے''۔ اس نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''مثلاً کون سے باب میں؟'' میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں آخری باب میں یا شاید پہلے باب میں''۔ اس نے چوگان ہستی کھول کر میرے سامنے رکھ دی اور کہا۔ ''آپ وثوق سے فرمایئے پہلی باب میں یا آخری باب میں؟'' میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور جلدی سے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجئے گا۔ اس وقت مجھے ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ میری خالہ کا بھائی فرنٹیئر میل سے آرہا ہے

آپ پھر کسی وقت تشریف لائیے'' ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر مجھے میرے گھر پر ملا۔ اس دن میں نے جھوٹ موٹ عدیم الفرصتی کا بہانہ پیش کیا۔ '' مجھے آج ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ بھینس بیمار ہے۔ اسے ہسپتال لے جانا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لیے بہتر صفحات کا ایک فیچر لکھنا ہے۔ بچوں کے لیے ایک خرگوش خریدنا ہے''۔

اس نے سنجیدگی سے کہا۔'' کوئی مضائقہ نہیں میں پرسوں حاضر ہوں گا''۔

'' پرسوں نہ آیئے گا۔ میں راولپنڈی جا رہا ہوں''۔

'' بہت اچھا۔ اتوار کو سہی''۔

'' دیکھئے اتوار کو میرے بھتیجے کی شادی ہے۔ اس دن تشریف نہ لایئے گا''۔

'' سوموار کو آ جاؤں''۔

'' میرے ایک عزیز دوست سخت بیمار ہیں۔ شاید وہ سوموار کو چل بسیں۔ اس لیے آپ سوموار کو نہ آیئے گا''۔

'' منگلوار کو آ سکتا ہوں؟''۔

'' ہاں ہاں منگلوار کو ضرور آیئے لیکن شام کو''۔

منگلوار کی شام کو میں ایک دوست کے گھر چھپ کر بیٹھ رہا اور اس طرح اس دن یہ بلا ٹل گئی۔ چند دنوں کے بعد اس نے مجھے کافی ہاؤس میں آ دبوچا اور پوچھا۔'' گنودان اور چوگان ہستی میں آپ کس ناول کو ترجیح دیتے ہیں''۔ میں نے کہا۔'' گنودان، منشی جی کا آخری ناول ہے۔ اس لحاظ سے میں اسے چوگان ہستی سے بہتر سمجھتا ہوں''۔

'' یہ کوئی معقول وجہ نہیں''۔

'' معقول وجہ کیوں نہیں، آخر جو ڈرامے شیکسپیئر نے آخری دنوں میں لکھے، انہیں ہمیشہ ان ڈراموں پر ترجیح دی جاتی ہے جو اس نے اوائل عمر میں لکھے''۔

'' لیکن اس سے آپ یہ کلیہ گھڑ سکتے ہیں کہ مصنف کی آخری تصنیف اس کی پہلی تصانیف سے بہتر ہوتی ہے''۔

'' کیوں نہیں''۔

'' آپ کس اعتبار سے '' گنودان'' کو '' چوگان ہستی'' سے بہتر سمجھتے ہیں؟''۔

''اس لیے کہ......اس لیے کہ......اس کا اختتام بہتر ہے''۔

''کس لحاظ سے''۔

''اس لحاظ سے کہ جب ہم گنودان پڑھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے اس کا وہی اختتام ہونا چاہیے تھا، جو ہے''۔

اس کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے پھر کسی دن اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے مجھ سے وقت مانگا۔ اس دن کے بعد وہ کئی دن میرے مکان پر آیا اور میں نے ہر بار اندر سے کہلوا بھیجا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ آج کل وہ میرے مکان پر نہیں آتا۔ لیکن جہاں کہیں مجھ سے ملتا ہے۔ پوچھتا ہے۔ ''آپ نے تفصیل سے نہیں بتایا کہ آپ کو پریم چند کو کون سا ناول پسند ہے''۔ اور میں جھٹ یہ کہہ کر۔ ''اس وقت مجھے ذرا جلدی ہے۔ پھر عرض کروں گا''۔ کنی کاٹ جاتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں، کسی دوسرے شہر چلا جاؤں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ اس سے ایک دن صاف صاف کہہ دوں کہ میں نے پریم چند کا کوئی ناول نہیں پڑھا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں اس مقالے کا کیا بنے گا جو میں نے پریم چند کی دوسری برسی کے موقع پر پڑھا تھا۔

☆☆☆

روٹی تو کس طور......

''منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید!'' میں وہ بدقسمت انسان ہوں جس کی امید مرنے پر منحصر ہے، اپنے مرنے پر نہیں، دوسروں کے مرنے پر۔ ہر رات سونے سے پہلے دعا مانگتا ہوں۔ یا رب العالمین! فلاں شاعر، فلاں لیڈر، فلاں محبّ وطن اب تو کافی بوڑھا ہو گیا، پچھلے دس برس سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے، اب تو اسے اٹھالے، اب تو بیچارے کے نہ ہاتھوں میں جنبش ہے نہ آنکھوں میں دم! اسے جنت میں جگہ دے یا جہنم میں، کم از کم مجھے اس کے نام پر چندے کا ایک نیا فنڈ کھولنے کا موقع دے۔ میں اس کا بت نصب کروں گا، اس کی یاد میں عظیم الشان لائبریری قائم کرنے کے لیے اپیل کروں گا، اس کی پسماندگان کی امداد کے لیے قوم سے خیرات مانگوں گا، پانچ ہزار۔ دس ہزار۔ پندرہ ہزار۔ آخر کچھ تو قوم کی جیب سے نکلے گا ہی، اے ذوالجلال۔ کل کے اخبار میں پہلی سرخی جو پڑھوں وہ کسی بڑے لیڈر کی موت سے متعلق ہو۔ خدا

ونداؔ! میری مالی مشکلات تجھ سے پوشیدہ نہیں، لڑکے کو ولایت بھیجنا ہے، لڑکی کی شادی نزدیک آ رہی ہے، کم از کم پندرہ ہزار روپیہ چاہئے۔ اگر اس مہینے تین لیڈروں کو قیدِ حیات سے نجات دلانا تیرے لیے چنداں مشکل نہیں۔ اگر یہ کسی طرح ناممکن ہے تو پھر کوئی قحط، سیلاب یا بھونچال ہی بھیج، بنگال کا قحط تو پرانا ہو چکا۔ اب تو کسی نئی آفت کی ضرورت ہے۔ کوئی وبا، کوئی طوفان، پلیگ، ہیضہ، ٹڈی دل، کوئی مصیبت جس کے نام پر سنگدل سے سنگدل انسان چندہ دینے پر مجبور ہو جائے۔

جی ہاں میرا ہی نام ہے آقا طہرانی۔ میں تہران کا رہنے والا ہوں، تعلیم یہی سات جماعت۔ آباؤ اجداد ہینگ کا بیوپار کرتے تھے۔ ان کی تقلید میں ہینگ بیچتا ہوا بمبئی پہنچا۔ دیکھا کہ بمبئی کے لوگ ہینگ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ ہینگ چھوڑ کر گیتوں کی تجارت شروع کر دی۔ اب میں فلموں کے لیے گیت لکھتا ہوں۔ ہر قسم اور ہر موقع کے گیت۔ ہجر کے گیت، وصال کے گیت، شادی کے گیت، طلاق کے گیت، ڈھولک کے گیت، ناچ کے گیت۔ ایک گیت پانچ روپے میں بیچتا ہوں، خاصی آمدن ہو جاتی ہے۔ صبح و شام بمبئی کے سٹوڈیوز کا طواف کرتا ہوں، گلے میں ہارمونیم چوبیس گھنٹے لٹکا رہتا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ کوئی نیم خواندہ پروڈیوسر پریشان خاطر نظر آتا ہے، فوراً چق اٹھا کر آداب بجالاتا ہوں اور نہایت انکساری کے ساتھ کہتا ہوں شیٹھ شاہب، تازہ فلم کے لیے گیت چاہیے؟ شیٹھ شاہب ہارمونیم پر گیت کی طرز سنتے ہیں، سر ہلا ہلا کر داد دیتے ہیں، اور منٹوں میں گیت کا سودا ہو جاتا ہے۔ گیتوں کے علاوہ غزلیں بھی کہتا ہوں۔ ان میں وزن اور معنی کے علاوہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ آپ کی دعا سے اس وقت بمبئی کا ہر جاہل ڈائریکٹر میرا لوہا مانتا ہے۔ یوں تو کمپنیوں کے پاس اپنے شاعر بھی ہیں لیکن وہ ٹھہرے بیچارے ادیب۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ مغز زنی کے باوجود شیٹھ شاہب کی پسند کا گیت نہیں لکھ سکتے۔ اس وقت آقا طہرانی کو فون کیا جاتا ہے، کئی بار ان شاعروں سے ٹکر لے چکا ہوں۔ ہمیشہ انہیں سمجھاتا ہوں۔ ”کم بختو! گیت لکھنے سے پہلے ہارمونیم بجانا سیکھو“۔

”جی ہاں، آپ صحیح فرماتے ہیں۔ یہ سب پیٹ کا دھندا ہے۔ ورنہ یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی آدمی بیس گز لمبا اور ڈیڑھ گز چوڑا ہو۔ یہ قبر جس کا میں مجاور ہوں، کسی فرضی ولی اللہ کی ہے۔ میں اسے پیر بیس گزہ کے نام سے پکارتا ہوں۔ دراصل اس قبر میں کسی مردے کو دفن نہیں کیا گیا۔ پانچ

سال ہوئے میں نے رات بھر جاگ کر اسے تیار کیا۔ مجاور بننے سے پہلے میں بھک منگا تھا۔ لوگ مجھے دھتکارتے تھے۔ اب میری پرستش کرتے ہیں۔ یوں تو ہر شخص پیر بیس گزہ کا معتقد ہے، لیکن طوائفوں کو ان کے مزار سے خاص طور پر عقیدت ہے۔ سال میں دو بار عرس لگتا ہے۔ بمبئی، کانپور اور بنارس سے طوائفیں آتی ہیں۔ ہر ایک طوائف کے جلو میں درجنوں تماشبین ہوتے ہیں، طوائفیں غزلیں گاتی ہیں، قوال قوالیاں سناتے ہیں، خاصی رونق ہو جاتی ہے۔ ان سب کو عرس کی آمدنی سے کمیشن ملتی ہے۔ یقین مانئے آج تک کوئی شخص اس مزار سے مایوس نہیں لوٹا۔ بانجھ عورتیں، ناکام عشق، شکست خوردہ انسان روتے ہوئے آتے ہیں اور ہنستے ہوئے گئے ہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنی آمدنی مجھے ایک عرس کی موقع پر ہوتی ہے۔ اس سے پانچ سکول اور دس ہسپتال کھولے جا سکتے ہیں۔ لیکن مجھے ہسپتالوں اور سکولوں سے کیا غرض مجھے چاہیے شراب، خوبصورت عورتیں، جوا کھیلنے کے لیے روپیہ اور ساری نعمتیں۔ مجھے پیر بیس گزہ کی عنایت سے میسر ہیں۔ پیر بیس گزہ! جو نہ کبھی پیدا ہوا نہ مرا، لیکن جس نے مجھ جیسے قلاش کو پانچ سال کی قلیل مدت میں بھک منگے سے جاگیردار بنا دیا''۔

''ہاں صاحب! اس وقت تقریباً ڈیڑھ سو فحش کتابوں کا مصنف ہوں۔ عالی شان کوٹھی میں رہتا ہوں، کار میں سفر کرتا ہوں، تین بیویاں ہیں، چار نوکر جی ہاں۔ یہ سب فحش کتابوں کی بدولت ہے۔ پہلے پہل میں نے بھی شریف آدمیوں کی طرح دو ایک سنجیدہ کتابیں لکھیں۔ نتیجہ؟ وہی ڈھاک کے تین پات، اتنی آمدنی بھی نہ ہوئی کہ ایک اچھا سا کوٹ سلوا سکتا، اب خدا کا فضل ہے، ادھر کتاب چھپی ادھر ایڈیشن ختم۔ بعض اوقات تو کتاب چھپنے سے پہلے ہی ایڈیشن ختم ہو جاتا ہے۔ یوں تو سارے ہندوستان میں میری کتابوں کی دھوم ہے۔ تاہم پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ان کی خاص مانگ ہے۔ لطف یہ کہ لکھتے وقت زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑتی تین چار بنے ہوئے پلاٹ ہیں، انہیں تھوڑی سے تصرف کے ساتھ ہر کتاب میں دہرا دیتا ہوں۔ ایک پلاٹ ہے۔ شریف گھر کی دوشیزہ جس نے خانساماں سے عشق کیا، اور جو بعد کو ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ ایک پلاٹ ہے کالج کی لڑکی جس نے کالج کے ہر لڑکے کے ساتھ آنکھیں لڑائیں۔ ایک پلاٹ ہے۔ شریف زادہ جو شہر کی ہر طوائف کے پاس گیا۔ خود غرض

اور حاسد قسم کے لوگ کہتے ہیں میں ہندوستانیوں کا اخلاق تباہ کر رہا ہوں۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ ہندوستانیوں کا اخلاق ہے تو میں پوچھتا ہوں جب رشوت ستانی، غداری، نا اتفاقی اور اس قسم کی ہزاروں لعنتیں اسے تباہ نہیں کر سکیں تو میری تصنیفات کی کیا بساط ہے۔ صاحب یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ عوام کو غرض ہے نہ مجھے۔ اب خوامخواہ کوئی معلم اخلاق چیں بہ چیں ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ آخر میں اس کی خاطر اپنی روش بدلنے سے تو رہا!!!

☆☆☆

کاٹھ کا الو

اب جبکہ سیٹھ کچومرل کی کامیابی کی خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ وہ ہمارے حلقے سے پارلیمنٹری انتخابات میں کامیاب کس طرح ہوئے۔ سیٹھ کچومرل عمر انتالیس سال (لیکن معلوم انچاس کے ہوتے ہیں) ایک آنکھ اصلی ایک مصنوعی، چہرا لمبوترا، وضع قطع غیر شریفانہ، لباس عموماً غلیظ جس سے لہسن اور ہینگ کی ملی جلی بو آتی ہے۔ تعلیم صفر، پیشہ، کوئلہ، چونا اور اینٹوں کی خرید و فروخت۔ سیٹھ صاحب موصوف ہمارے حلقے سے بطور آزاد امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ کسی پارٹی کے ٹکٹ پر اس لیے کھڑے نہ ہو سکے کہ پارٹی دفتروں کے بجائے یہ ڈاکخانوں اور ریلوے اور سینما ٹکٹ گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ الیکشن کے ٹکٹ ان جگہوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔

یکم نومبر کی رات کے دو بجے ساری دنیا مزے کی نیند سو رہی تھی۔ سیٹھ صاحب کو الہام ہوا کہ انہیں پارلیمنٹ کے لیے کھڑا ہونا چاہیے۔ یہ الہام کچھ شدت سے ہوا کہ آپ اپنے بستر پر سر کے بل کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ تھک کر پھر بستر پر نہ گر پڑے۔ دوسرے دن انہوں نے کاغذات نامزدگی داخل کروائے۔ یہ اسی دن گیارہ بجے کا ذکر ہے کہ آپ کی ملاقات مجھ سے سر راہ ہوئی، کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ میں نے پوچھا سیٹھ صاحب! کیا بات ہے؟

بھنا کر کہنے لگے عجیب مصیبت ہے یہ بھی۔

کیا عجیب مصیبت ہے؟

آپ کوالیکشن سے کیا۔ آپ مزے سے کوئلہ بیچئے ہنشان منتخب کرنے والے کرتے رہیں گے۔

کوئلہ تو ہر روز بیچتا ہوں لیکن الیکشن تو روز روز نہیں آتے۔

خدانخواستہ کہیں آپ الیکشن کے لیے تو کھڑے نہیں ہو رہے ہو؟

ہو نہیں رہا۔ ہو گیا ہوں، ابھی ابھی کاغذات داخل کر کے آیا ہوں۔

لیکن آپ اور الیکشن؟

ہاں ہاں کیوں نہیں، جب چمڑا بیچنے والے، جوتا چرانے والے بوٹ پالش کرنے والے الیکشن کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں تو کوئلہ بیچنے والے سیٹھ کچومرل نے کیا پاپ کیا ہے کہ وہ......

بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں اچھا...... تو مبارکباد قبول فرمایئے۔

مبارکباد تو بعد میں دیکھی جائے گی پہلے یہ بتایئے کہ نشان کون سا چنا جائے؟

کوئی بھی چن لیجئے درجنوں ''نشان'' ہیں۔

مثلاً۔

ڈگڈگی کے متعلق کیا خیال ہے؟

نشان تو اچھا ہے لیکن کمبخت مداری لال نے چن لیا۔

ریچھ۔

یہ بھی منتخب کیا جا چکا ہے۔

لنگور۔

اس کے متعلق تو دو امیدواروں میں خاصہ جھگڑا ہو چلا تھا۔ آخر قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوا۔

بارہ سنگھا۔

یہ کوئی اچھا نشان نہیں۔

لگڑ بگڑ

بہت خونخوار نشان ہے۔

میں نے سیٹھ صاحب کو بیسیوں نشان بتائے، لیکن انہیں کوئی پسند نہ آیا۔ آخر میں نے ان سے یہ کہہ کر رخصت چاہی کہ شام کو سوچ کر بتاؤں گا۔

سارا دن اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ سیٹھ صاحب کے لیے کون سا نشان موزوں رہے گا۔

سیٹھ صاحب سے میری پرانی رسم وراہ تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں مایوس کروں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ پاؤلے کتے سے لے کر دم کٹی گلہری تک۔ چمگادڑ سے لے کر کھٹمل تک کوئی بھی ان کے لیے موزوں نہیں۔ میں نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ میں تلاش نہیں کر سکا۔ وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور اس لہجے میں کہنے لگا، عجیب بات ہے آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی کوئی نشان تجویز نہیں کر سکا۔

بات تو واقعی عجیب ہے لیکن کیا بھی کیا جائے کوئی بھی نشان آپ پر ٹھیک نہیں بیٹھتا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے ایسی آواز میں کہا جس پر چیخ کا گمان ہوتا تھا اور ساتھ ہی اپنی اصلی اور مصنوعی آنکھ سے میری طرف گھورنے کی کوشش کی۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا گویا میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک جیتے جاگتے الو کو اپنے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے مسرت سے چلا کر کہا۔ مل گیا سیٹھ صاحب مل گیا۔

کیا ہے مجھے بھی تو بتائیے۔

بخدا انہایت موزوں نشان ہے۔

''کاٹھ کا الو''۔

''کاٹھ کا الو''۔

ہاں ہاں کاٹھ کا الو۔ بخدا انہایت مناسب نشان ہے۔

آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔؟

بالکل نہیں دیکھئے نا اچھوتا نشان ہے۔

اچھوتا، وہ کیسے!

اچھوتا تو ہے ہی۔ لیکن اچھوتا ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے۔ کوئی ووٹر اس نشان کو آسانی سے بھول نہیں سکے گا۔

مگر کچھ عجیب سا۔

ذرا بھی عجیب نہیں۔ آپ شاید اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ذرا مزاحیہ ہے لیکن سیٹھ صاحب! اس میں کوئی قباحت نہیں دوسرے یہ صرف کاٹھ کا الو ہے۔ اصلی یعنی گوشت پوست کا الو نہیں اور آپ جانتے ہیں کہ دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔

سیٹھ صاحب کی تسلی نہ ہوئی لیکن ایک گھنٹہ کی بحث کے بعد میں نے انہیں یہ نشان اپنانے پر رضامند کرلیا۔

اچھا اب یہ بتایئے کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑے گا؟ سیٹھ صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

بہت کچھ۔

پھر بھی۔

سب سے پہلے تو ایک ہوشیار سا پروپیگنڈا سیکرٹری تلاش کیجئے۔

اس کے بعد؟

اس کے بعد ووٹروں کا اعتماد حاصل کیجئے۔

وہ کیسے؟

یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

پھر بھی۔

بس کسی نہ کسی طرح انہیں یقین دلا دیجئے کہ آپ بہترین امیدوار ہیں۔

یقین تو دلایا جا سکتا ہے۔

تو پھر پرماتما کا نام لے کر الیکشن کے میدان میں کود پڑیئے۔

سیٹھ صاحب نے منشی قلم دین ایڈیٹر ''قلمدان'' کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس سے انہیں دو فائدے ہوئے ایک تو اخبار ''قلمدان'' کے کالموں میں ان کا باقاعدہ پروپیگنڈا ہونے لگا۔ دوسرے ایک بہترین ادیب کی خدمات صرف ان کے لیے وقف ہوگئیں۔ منشی قلم دین کی ذہانت وفطانت کا اندازہ ان دو پوسٹروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے سیٹھ صاحب کے لیے تحریر کیے۔ پہلے اشتہار کا عنوان تھا ''اس لیے کہ''

کاٹھ کے الو کو ووٹ دیجئے۔

اس لیے کہ

کاٹھ کا الو کاٹھ کا الو ہے۔

کاٹھ کا الو سیاست کو بالکل نہیں سمجھتا۔

اس لیے کہ۔

سیاست کے علاوہ بھی وہ کسی چیز کا نہیں سمجھتا۔

اس لیے کہ۔

اگر آپ اسے ووٹ دیں گے تو ملک وہیں رہے گا۔ جہاں اب ہے۔ یعنی تنزل کی طرف نہیں جائے گا۔

اس لیے کہ۔

کاٹھ کا الو بہترین امیدوار ہے۔ کیونکہ اس سے بڑا کاٹھ کا الو کوئی نہیں۔

دوسرے اشتہار کی عبارت یہ تھی۔

میں وعدہ کرتا ہوں۔

کہ پارلیمنٹ کا ممبر بنتے ہی۔

ہر بالغ ونابالغ کا راشن تگنا کر دوں گا۔

پانچ سال کے لیے کسی شخص پر انکم ٹیکس نہیں لگنے دوں گا۔

آٹے کا بھاؤ پندرہ روپے من سے پندرہ آنے من کر دوں گا۔

خالص گھی آٹھ آنے سیر ملے گا۔

گھروں میں جتنے چوہے ہیں، ان سب کو چن چن کر مروادوں گا۔

ان اشتہاروں کا دیواروں پر چسپاں ہونا تھا کہ ساری شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ تہلکہ مچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشتہار پر دائیں طرف سیٹھ صاحب کی تصویر تھی اور بائیں طرف کاٹھ کے الو کی، لیکن ذہین سے ذہین آدمی بھی تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ سیٹھ صاحب اور کاٹھ کے الو میں کیا فرق ہے یہ تصویریں مشہور آرٹسٹ ملوسنگھ نے کہ جو ''کلوسکول آف آرٹ'' سے تعلق رکھتے تھے، بنائی۔ ان دونوں اشتہاروں کا عوام پر بہت اثر ہوا۔ اکثر و بیشتر ووٹروں نے تسلیم کیا کہ سیٹھ صاحب نے سیاست سے اپنی لاعلمی اور ناواقفیت کا اعتراف کر کے اعلیٰ درجے کی اخلاقی جرات کا ثبوت دیا ہے''میں وعدہ کرتا ہوں''۔

مقابلہ جب دوسرے امیدواروں کے وعدوں سے کیا گیا تو ان کے سب وعدے ہیچ نظر آنے لگے۔ لیکن سیٹھ صاحب نے صرف اشتہاروں پر اکتفا نہیں کی۔ عوام کا اعتماد حاصل کرنے

کے لیے انہوں نے اپنی فرم ''کچومرل اینڈ سنز'' کی سلور جوبلی منانے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ان کی فرم کو قائم ہوئے مشکل سے پانچ سال ہوئے تھے کہ نہایت پر تکلف دعوت کی گئی جس میں تمام سر کردہ ووٹروں کو مدعو کیا گیا۔ دعوت کے اختتام پر سیٹھ صاحب نے یہ اعلان کیا۔ میں اس مبارک موقع پر اعلان کرتا ہوں کہ ہر دھرم استھان یعنی مندر، مسجد، گوردوارے کی سفیدی اپنے ذمے خرچ اور اپنی فرم کے خالص چونے سے کراؤں گا۔ ہر دھرم استھان کی چار دیواری کی مرمت کے لیے جتنی اینٹوں کی ضرورت ہوگی ''کچومرل اینڈ سنز'' ان کے لیے ایک پائی لینا بھی پاپ سمجھیں گے۔

اس اعلان سے ان کے دھر ماتما پن کی دھاک بیٹھ گئی اور جب واقعی انہوں نے شہر کے سب سے بڑے مندر میں بیس سیر کوئلہ بھجوا دیا تو دسمبر کی سخت سردی میں ٹھٹھرنے والے پجاری اور بھگت ان کے نام کی مالا جپنے لگے۔ پندرہ دسمبر سے پچیس دسمبر تک ہر روز سیٹھ کچومرل کا جلوس نکالا گیا۔ ایک جیپ میں جس کی اگلی سیٹ پر ایک بڑا وزنی کاٹھ کا الو رکھا گیا تھا۔ سیٹھ صاحب کو بٹھایا گیا۔ ہزاروں تماشائی کاٹھ کے الو کو دیکھنے کی لیے جمع ہو گئے۔ شہر کے پانچ اسکولوں کے طلبہ کو مٹھائی کا لالچ دے کر سمجھایا گیا کہ جلوس کے ساتھ ساتھ چلیں اور ہر پانچ منٹ بعد منشی قلم دین قلم کی لکھی ہوئی قلم نظم مل کر گائیں۔

کاٹھ کا الو پیارا پیارا
کاٹھ کا الو آنکھ کا تارا
کاٹھ کا الو سب سے نیارا
کاٹھ کا الو کبھی نہ ہارا

شہر کی مختلف حصوں میں کاٹھ کا الو کے حق میں جلسے کیے گئے، جن میں منشی قلم دین قلم کی لکھی ہوئی تقریریں پڑھی گئیں۔ عوام کو بتایا گیا کہ کاٹھ کا الو پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہونے کے بعد ان کے لیے کیا کیا کرے گا۔ قریب قریب ہر تقریر میں یہ بات دہرائی گئی کہ کاٹھ کا الو پارلیمنٹ سیاست کی الف ب سے بھی ناواقف ہے، اسے کوئلہ چونا اور اینٹیں بیچنے کا کافی تجربہ ہے۔ گو وہ عوام کے مسائل سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن اسے اس معاملے میں معذور سمجھا جائے۔ کیونکہ عوام کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ گو اسے یہ معلوم نہیں کہ آیا دہلی

ہندوستان کی راجدھانی ہے یا ہندوستان دہلی کی۔اسے معاف کر دیا جائے گا کیونکہ اس نے جغرافیہ کبھی پڑھا ہی نہیں۔ان تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے لوگ جو سیٹھ کچومرل کو محض کوئلے کا تاجر سمجھا کرتے تھے،اسے اعلیٰ درجے کا سیاستدان سمجھنے لگے اوران میں سے بیشتر کوئلہ بھی اسی سے خریدنے لگے۔

سیٹھ کچومرل کے مقابلے میں صرف دو امیدوار تھے۔ایکشن سے چندروز پہلے منشی قلم دین نے ایک کو سیٹھ صاحب کے حق میں دستبردار ہونے پر رضا مند کرلیا۔دستبرداری کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ منشی صاحب نے اسے یہ بات ذہن نشین کرادی کہ اگر تم جیت گئے تو لوگ کہیں گے کہ کاٹھ کا الو کے مقابلے میں جیتا ہے اوراگر ہار گئے تو لوگ لعنہ دیں گے کہ کاٹھ کا الو نے ہرادیا۔

دوسرا امیدوار آخر دم تک ڈٹا رہا کہ نہایت سخت جان واقع ہوا تھا۔اس کو سیٹھ صاحب کے مقابلے میں صرف پانچ فیصد ووٹ ملے اور بیچارے کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔یہ صحیح ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تھا''سیاست'' کو سمجھتا تھا،شاید عوام کی خدمت بھی کرسکتا تھا۔مگراس کم بخت نے غلطی یہ کی کہ اپنا نشان ''ہما'' منتخب کرلیا۔اورآپ جانتے ہیں کہ اپنے دیش میں ''کاٹھ کا الو'' کے مقابلے میں ''ہما'' کو کون پوچھتا ہے۔

☆☆☆

وزیر ٹیکس

اس دن جب مجھے وزیر ٹیکس کا خط ملا تو میں بہت حیران ہوا۔وزیر ٹیکس سے میری رسم وراہ تک نہ تھی اور مجھے سان گمان نہیں تھا کہ مجھے نہ صرف خط لکھے گا بلکہ اپنے یہاں چائے پر مدعو بھی کرے گا۔وزیر ٹیکس نے لکھا تھا۔

''محترمی!

مجھے آپ کی آج بہت ضرورت ہے۔اگر ہو سکے تو چار بجے میرے یہاں تشریف لائیے اورمیرے ساتھ چائے پیجئے،آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

مخلص

وزیر ٹیکس

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وزیر ٹیکس جیسے سمجھدار آدمی سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یعنی اس نے یہ دعوت نامہ کسی اور کو بھجوانے کی بجائے مجھے بھجوا دیا ہے۔ پہلے تو میں اس کے ہاں جانے سے جھجکا لیکن تین بجے وزیر ٹیکس کے سیکرٹری نے فون پر مجھ سے وقت مقررہ پر پہنچ جانے کی درخواست کی تو میں یہ سمجھا کہ وزیر ٹیکس ضرور کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اسے میرے مشورے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک چار بجے اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

''جے ہند مزاج کیسے ہیں؟ آج موسم خوشگوار ہے۔ تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ! وغیرہ وغیرہ رسمی باتوں کے بعد وزیر ٹیکس مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک پر تکلف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیرا چائے لایا۔ وزیر ٹیکس نے میرے لیے چائے کا پیالہ بناتے ہوئے کہ کہا آپ حیران ضرور ہوں گے کہ میں نے آپ کو خط بھیجا لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھے واقعی آپ کی ضرورت ہے۔

فرمایئے۔ میں نے عاجزی سے کہا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔؟

مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ بڑے ذہین آدمی ہیں۔

صاحب! میں کیا ہوں یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

کسر نفسی کی ضرورت نہیں۔ آپ واقعی بڑے ذہین آدمی ہیں۔ اور مجھے اس وقت واقعی ذہین آدمی کی ضرورت ہے۔

فرمایئے۔

آپ جانتے ہیں میں خسارے کا بجٹ تیار کرنے کا ماہر ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں تین سال ہوئے آپ نے بجٹ میں پچاس کروڑ کا خسارہ دکھایا تھا۔

پچھلے سال ستر کروڑ اور اس سال تو آپ نے اپنے تمام پچھلے ریکارڈ مات کر دیئے یعنی ننانوے کروڑ۔

بس اسی کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے۔

گستاخی معاف! لیکن مجھے بجٹ تیار کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنا ذاتی بجٹ تیار کرنے میں بھی اکثر ناکام رہتا ہوں۔ اسی کو لیجئے کہ آج مہینے کی بیس تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف ایک کھوٹی چونی ہے۔ اور ابھی بجلی کا بل، درزی کا بل اور اسی قسم کے متعدد بل

مجھے ادا کرنے ہیں۔ اس حالت میں......

چھوڑیئے یہ قصہ، وزیر ٹیکس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا، آپ کے بٹوے میں کم از کم کھوٹی چونی تو ہے۔ یہاں خزانے میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔

عجیب بات ہے لیکن آپ اتنے نئے ٹیکس ہر سال لگاتے ہیں، وہ روپیہ کہاں جاتا ہے۔؟

! آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں۔ وزیر نے ذرا بے تکلف ہوتے ہوئے کہا...... یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر ادھر میں نئے ٹیکس لگاتا ہوں تو ادھر فوراً اخراجات بڑھا دیتا ہوں۔ اس حالت میں خزانے میں کچھ بچ رہنے کے کیا امکانات ہیں؟

لیکن اخراجات کیوں بڑھاتے ہیں؟ میں نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا۔

اخراجات نہ بڑھاؤں تو خسارہ کیسے دکھا سکتا ہوں۔؟

خسارہ نہ دکھایئے۔ میں نے آہستہ سے کہا

خسارہ نہ دکھاؤں؟ وزیر ٹیکس نے چمک کر کہا۔ تو پھر وزیر ٹیکس کیسے رہ سکتا ہوں۔؟ پھر تو مجھے وہی کرنا پڑے گا جو پیشہ آباء ہے۔

یعنی؟

خیر چھوڑیئے، یہ قصہ، ہاں تو یہ بات ہے کہ مجھے اخراجات بڑھانا ہی پڑتے ہیں۔ دراصل میں اس معاملہ میں کچھ مجبور سا ہوں۔ اب اس سال ہی دیکھئے......

ہاں ہاں اس سال......

اس سال میں نے نو نئے وزیر مقرر کیے۔ دس نئے سفیر غیر ممالک میں بھیجے، پانچ سو نئے سیکرٹری تعینات کیے۔ ساڑھے سات سو ڈپٹی سیکرٹری پندرہ سو اسسٹنٹ ڈپٹی سیکرٹری اور اگر سب اسسٹنٹ ڈپٹی سیکرٹریوں کی تعداد پوچھو تو شاید بتا بھی نہ سکوں۔

نو وزیر۔ دس سفیر! یہ تو ناقابل یقین سی بات معلوم ہوتی ہے۔

ناقابل یقین؟ اچھا گن لیجئے۔ وزیر قحط۔ وزیر دعدہ، وزیر تقریر، وزیر جلسہ، وزیر جلوس، وزیر جیل، وزیر مذاق، وزیر حادثہ، وزیر اعداد و شمار۔

اور سفیر کون سے نئے ممالک میں بھیجے؟

ان ممالک کے نام تو مجھے بھی اچھی طرح نہیں آتے بس یہ سمجھ لیجئے کہ اب دنیا کے کونے

کونے میں ہمارے سفیر ہیں۔مثلاً ایک جزیرہ '' جگ مگ مگ جگ' ہے.بحرالکاہل میں ہے۔
یا شاید بحراوقیاس میں اس کارقبہ صرف ایک مربع میل ہے۔آبادی پچاس ساٹھ کے قریب ہو
گی۔وہاں میں نے ابھی ابھی ایک سفیر کو تعینات کیا ہے۔

لیکن یہ نئے وزیر اور سفیر کچھ کام بھی کرتے ہیں یا محض اخراجات بڑھانے کے کام آرہے ہیں۔

اخراجات بڑھانا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔لیکن اس کے علاوہ بھی یہ اور بہت سے
کام انجام دیتے ہیں۔مثال کے طور پر وزیر قحط کو لیجئے۔

ہاں ہاں،ان حضرات کا کیا کارنامہ ہے؟

ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ملک کی ہر چھوٹی بڑی ریاست پر قحط مسلط کر رہے ہیں۔ابتداء
انہوں نے ایک شمالی مشرقی ریاست سے کی ہے،لیکن انتہا کہاں کریں گے۔اس کا علم ان کے سوا
کسی کو نہیں۔یہ حضرت جب چاہیں کسی قسم کے قحط کو معرض وجود میں لا سکتے ہیں۔خوراک کا قحط،
کپڑے کا قحط،مٹی کے تیل کا قحط یا محض مٹی کا قحط۔

خوب!میں نے مسکرا کر کہا.........اور وزیر مذاق؟

ہاہاہا وزیر مذاق!بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ان کا کام عوام سے مذاق کرنا ہے۔جوں
ہی کوئی مسئلہ عوام کی پریشانی کا باعث بنتا ہے اور ان کی توجہ اس طرف دلائی جاتی ہے،یہ اسے ہنسی
مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔

مثلاً؟''

اگر عوام شکایت کریں کہ چائے حد سے زیادہ مہنگی ہوگئی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اگر چائے مہنگی
ہوگئی ہے تو سوکھی گھاس کا جوشاندہ پیا کیجئے۔

جی ہاں!یہ بات نہ ہوتی تو میں انہیں پانچ ہزار ماہانہ پر تعینات نہ کرتا۔خیر چھوڑیئے یہ قصہ
،ہم اصل موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔دراصل میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلوایا کہ نئے
وزیروں یا سفیروں کے کارناموں سے آگاہ کروں میرا مطلب کچھ اور ہی تھا۔

ارشاد۔

آپ چونکہ ذہین آدمی ہیں ،اس یے ذرا اپنے دماغ سے کام لیجئے اور مجھے بتایئے کہ
ننانوے کروڑ روپے کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے کون کون سے نئے ٹیکس لگائے جائیں؟

نئے ٹیکس! گستاخی معاف! میں نے ذرا بھنا کر کہا...... پہلے ہی آپ نے ٹیکس لگا لگا کر عوام کی کمر کبڑی کر دی ہے، خدارا نئے ٹیکس لگانے کے ارادے سے باز آیئے۔

عوام پر ٹیکس،؟ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں نے تو عوام پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ یہ صحیح ہے میں نے تمباکو پر ٹیکس لگایا، پان پر لگایا لیکن عوام تمباکو ہیں نہ پان۔

ظالم! میں نے وزیر ٹیکس سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ یہ ٹیکس عوام پر ہی تو ہیں۔ عوام پان یا تمباکو نہ سہی۔ لیکن پان کھاتے اور تمباکو پیتے تو ہیں۔

یہ اور بات ہے۔ اچھا چھوڑیئے یہ قصہ، اب جلدی جلدی بتایئے کہ کون سے نئے ٹیکس......؟

آپ ٹیکس لگانے پر مصر ہیں؟

بالکل۔

اچھا تو سگائی کے متعلق کیا خیال ہے؟

سگائی؟ کس کی سگائی؟ میری یا آپ کی؟

ہاہاہا واہ وزیر ٹیکس صاحب! آپ ہیں تو وزیر۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ ہیں نرے کا......

بس بس آگے مت کہیئے۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن...... لیکن سگائی کا ٹیکس سے کیا تعلق ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

میرا مطلب ہے سگائی ٹیکس۔

اچھا۔ اچھا سگائی ٹیکس۔ خوب، خوب! بہت دور کی سوجھی۔ بھئی واہ کیا بات ہے۔ سگائی ٹیکس۔ واقعی آپ ذہین ترین آدمی ہیں۔

آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

اچھا بھلا اندازا بتایئے۔ آپ کے ملک میں ہر سال کتنی سگائیاں ہوتی ہیں؟

یہ تو کسی پنڈت سے دریافت کیجئے

نہیں نہیں مذاق چھوڑیئے بتایئے۔

کوئی دس بارہ لاکھ۔

ٹھیک اگر ہر سگائی پر دس روپے ٹیکس لگایا جائے تو ایک کروڑ سے کچھ زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ اچھا اور کوئی ٹیکس تجویز کیجئے۔

پیدائش ٹیکس۔

بہت خوب، بہت خوب، میرے خیال میں اپنے ملک میں ہر سال پچاس لاکھ نئے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ پانچ روپیہ فی بچہ ٹیکس ٹھیک رہے گا۔

زیادہ ہے غریب لوگ نہیں دے سکیں گے۔

تو پونے پانچ کر دیجئے۔ پچاس لاکھ ضرب پونے پانچ...... کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اب آگے چلئے۔

کفن ٹیکس۔

ہاں ہاں کفن ٹیکس! کیوں نہیں، اگر پیدائش ٹیکس لگ سکتا ہے تو کفن ٹیکس لگانے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس ٹیکس سے بھی پچاس ساٹھ لاکھ کی رقم دستیاب ہو سکتی ہے۔ چلئے یہ بھی نوٹ کرلیا اور......

بکری ٹیکس۔

مطلب۔؟

مطلب یہ کہ جو شخص بکری پالے، اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل گائے یا بھینس پالنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہے۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، لیکن میرے خیال میں اس ٹیکس کا دائرہ ذرا وسیع ہونا چاہیے۔ کتنے ہی لوگ مرغیاں، بٹیریں بطخیں، طوطے، کتے، بلیاں اور چوہے بھی تو پالتے ہیں۔

تو چلئے بکری ٹیکس کے علاوہ بٹیر ٹیکس، چوہا ٹیکس اور مرغی ٹیکس بھی لگا دیتے ہیں۔

اچھا اب کوئی ایسی چیز بتایئے جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو۔ میری رائے میں اگر اس پر ٹیکس لگایا جائے تو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔

سوچنا پڑے گا۔

ہاں ہاں دو تین منٹ سوچ لیجئے۔ میں اتنے میں سگریٹ پیتا ہوں۔

دو تین منٹ کے وقفے کے بعد میں نے کہا...... میرے خیال میں ایسی صرف دو چیزیں ہیں

فرمایئے۔

شیشہ اور کنگھا۔

شیشہ اور کنگھی! وزیر ٹیکس نے کرسی پر اچھلتے ہوئے کہا...... آپ واقعی ذہین ترین آدمی

ہیں۔شیشہ اور کنگھی اور! کنگھی اور شیشہ۔

کیا بات ہے واللہ!

اگر آپ ان دونوں پر ٹیکس لگا دیں۔ چاہے معمولی سا تو کروڑوں کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

کروڑوں؟ وارے نیارے ہو جائیں گے ...... اچھا اب ایک منٹ کے لیے دماغ کو پھر آزمائش میں ڈالئے اور پھر سوچ کر بتایئے کہ کوئی ایسی چیز رہ تو نہیں گئی جس پر ٹیکس نہیں لگایا۔آپ بھی سوچئے میں بھی سوچتا ہوں۔

چند ثانئے ہم دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔معاً وزیر ٹیکس نے کہا، ایک چیز کا تو مجھے پتا چل گیا ہے۔باقی آپ بتا دیجئے۔

وہ کون سی چیز ہے۔؟

برف!

برف؟

ہاں ہاں بھئی برف! جانتے نہیں گرمی کے موسم میں ہر آدمی برف استعمال کرتا ہے۔

خوب! بہت خوب! میں نے وزیر ٹیکس کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہا۔

اچھا اب آپ کہیئے، آپ نے کیا سوچا ہے۔؟

میرے خیال میں تو ابھی بہت سی چیزیں باقی ہیں۔مثال کے طور پر غرارہ۔

آپ کا مطلب ہے ریشمی غرارہ؟

ہاں؟

اس پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا۔

کیوں؟

اس لیے کہ......وزیر ٹیکس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔شری متی جی پہنتی ہیں، تو رہنے دیجئے، حنا کے متعلق کیا خیال ہے؟

حنا پر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔شری متی جی کو خاص طور سے حناء سے نفرت ہے۔

خضاب!

خضاب پر ٹیکس لگانا ٹھیک نہیں رہے گا۔والد محترم خضاب لگاتے ہیں......خضاب

کے علاوہ کوئی اور چیز بتائیے۔

عینک چھتری، بٹوہ، چاقو، چمچہ، دیگچی، لحاف، رضائی، تکیہ، تولیہ، جھومر، نتھ، بازو بند، گھڑی، فونٹین پین، ہلدی، مرچ، دار چینی، گرم مصالحہ۔

بس بس کافی ہیں۔ میرے خیال میں ننانوے کروڑ کا خسارہ پورا ہو جائے گا۔

اگر اب بھی پورا نہ ہوا تو پھر دھوپ اور پانی پر بھی ٹیکس لگا دیجئے گا۔

نہیں نہیں۔ میرے خیال میں اس سال یہ نوبت نہیں آئے گی۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔

اچھا تو اب مجھے اجازت دیجئے؟

بہت بہت شکریہ۔ وزیر ٹیکس نے مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے فرمایا۔ آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نہ صرف ذہین بلکہ ذہین ترین آدمی ہیں۔

☆☆☆

پیغام

بات یہ تھی کہ رسالہ ''ڈنگ ڈانگ بمبئی'' کے سالنامے کے لیے مضمون یا پیغام بھیجنے کا سب وزیروں نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن بار بار یاد دلانے کے باوجود ان میں سے کسی نے مضمون بھیجا نہ پیغام۔ بے چارہ ایڈیٹر عجیب مصیبت میں مبتلا تھا۔ سالنامے کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی، اور اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ وہ قارئین کو کیا منہ دکھائے گا۔ اس نے وزراء کو خطوط لکھے، تار بھجوائے، ٹیلیفون پر درخواست کی لیکن اسے ہر بار یہی کہا گیا کہ پہلی فرصت میں مضمون یا پیغام بھجوا دیا جائے گا۔ آخر یہ سوچ کر خدا جانے وزراء کو پہلی فرصت نصیب بھی ہو گی یا نہیں، اس نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو راجدھانی میں بھیجا کہ خود جا کر پتا چلائے کہ معاملہ کیا ہے؟

اسسٹنٹ ایڈیٹر نے سب سے پہلے یوجنا وزیر سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو متواتر چاروں ''یوجنا وزیر'' کے دفتر میں حاضر ہوتا رہا۔ لیکن ہر روز وزیر موصوف کے پرائیوٹ سیکرٹری نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ''یوجنا وزیر صاحب'' کو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ خوش قسمتی سے پانچویں دن ''وزیر یوجنا'' کو پانچ منٹ کی فرصت تھی اور ایڈیٹر نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے

ملاقات کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔

وزیر یوجنا نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں آپ کو چار منٹ ستاون سیکنڈ دے سکتا ہوں۔ جلدی سے کہہ ڈالئے آپ کیا چاہتے ہیں؟

ایڈیٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا ''ڈنگ ڈانگ کے لیے...... ''

''ہاں ہاں میں نے مضمون کا وعدہ کیا تھا۔''

''اگر آپ نے لکھ لیا ہو تو عنایت...... ''

''آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اور کوئی کام نہیں''...... وزیر یوجنا نے کافی تلخی سے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا...... ''آپ کا خیال ہے کہ مجھے اتنی فرصت ہے کہ فضول رسائل کے لیے فضول مضامین لکھتا رہوں''۔

''مضمون نہیں تو پیغام ہی سہی''۔ ایڈیٹر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''پیغام کے لیے بھی فرصت کہاں، دن رات یوجنا میں سوچ سوچ کر دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں سکت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ کوئی اور چیز ہی سوچ سکے۔''

''مختصر سا پیغام ہی عنایت فرمایئے۔''

''مختصر سا پیغام! میرے پاس کہنے کے لیے ایک لفظ تک نہیں۔ دراصل آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک نئی یوجنا سوچنے کے لیے کتنی دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے ہی میں سوچ رہا تھا کہ برف میں دیسی صابن تیار کرنے کی یوجنائی بنائی جائے تاکہ غریب لوگوں کو دیسی صابن سستے داموں مہیا کیا جا سکے۔ اس یوجنا پر پانچ کروڑ روپے صرف ہوگا۔ اڑھائی کروڑ تو امریکہ سے مشینری ہی آئے گی۔ ماہرین پر جو خرچ آئے گا وہ الگ۔ بیس سال کے بعد اس یوجنا کی بدولت دیسی صابن ڈیڑھ آنے فی من کے حساب سے مل سکے گا۔ غور کیجئے گا کہ عوام کو اس یوجنا سے کتنا فائدہ ہوگا۔''

''مگر برف سے دیسی صابن؟''

''کیسے تیار ہو سکتا ہے۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چھوڑیئے۔ اسے سمجھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ آپ ان ٹیکنیکل باتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ آپ کیا میرے علاوہ بہت کم لوگ انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک یوجنا کا اعلان کیا تھا کہ عنقریب سورج کی بنفشی کرنوں

سے شربت بنفشہ تیار کیا جائے۔اس اعلان پر چند ناسمجھ اڈیٹروں نے اخباروں میں بہت شور مچایا۔ان کے خیال میں یہ بات ناممکنات میں سے تھی۔لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس یوجنا پر پینتیس کروڑ روپیہ صرف کیا جائے تو پچاس سال کے اندر اسی لاکھ گیلن شربت بنفشہ تیار ہوسکتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ملک کو شربت بنفشہ کی کتنی ضرورت ہے۔''

''اگر پیغام بھی نہیں تو نئی یوجناؤں کے بارے میں اپنے ارشادات......''

''ہاں یہ ہوسکتا ہے، آپ میرے پرائیویٹ سیکریٹری سے ایک پمفلٹ جس کا نام ہی ''دلچسپ یوجنائیں ہے'' لے جائیے۔یہ باتصویر ہے اور آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔اگر آپ چاہیں تو تصویروں کے بلاک بھی آپ کو استعمال کرنے کے لیے دیئے جاسکتے ہیں۔اس پمفلٹ میں جتنی بھی یوجناؤں کا ذکر ہے۔سب عجیب وغریب ہیں۔مثال کے طور پر ایک یوجنا ہے''۔

'کوکو سے کونین تیار کرنا''۔

''بہت ہی دلچسپ یوجنا ہے''۔

''ایک اور یوجنا ہے''۔

''نمک سے گندھک کا تیزاب بنانا۔ایک یوجنا سورج مکھی کے پھولوں سے ربڑ تیار کرنے کے متعلق ہے۔ایک اور عجیب وغریب یوجنا،لیکن معاف کیجئے اپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔اس لیے آپ کو تفاصیل سے آگاہ نہیں کرسکتا۔آپ پمفلٹ میں پڑھ لیجئے گا۔خدا حافظ۔''

اڈیٹر نے وزیر موصوف کا شکریہ ادا کیا۔ان کی پرائیویٹ سیکرٹری سے پمفلٹ کی ایک کاپی لی اور''وزیر جلوس'' کے دفتر کا رخ کیا۔

''وزیر جلوس'' اپنے دفتر میں نہیں تھے۔وہ اپنی کوٹھی پر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے پلنگ پر دراز تھے۔ان کے پرائیویٹ سیکرٹری سے پتا چلا کہ وہ ابھی ابھی ایک نو میل لمبے جلوس سے واپس آئے ہیں اور ان کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔پندرہ منٹ آرام کے بعد ان کا ایک اور جلوس نکالا جائے گا جو پندرہ میل لمبا ہوگا۔اگر ان کی کمر دوہری ہونے سے بچ گئی تو ہاتھی پر سوار کرا کے بیس میل لمبا جلوس نکالا جائے گا......

اڈیٹر نے حیران ہو کر کہا۔

''اتنا لمبا جلوس!اگر وزیر جلوس عوام پر نہیں تو اپنی کمر پر ہی رحم فرمائیں ورنہ ایک دن......''

''ان کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ آپ کا یہ مطلب ہے؟'' پرائیویٹ سیکرٹری نے مسکرا کر کہا ''کوئی پرواہ نہیں، ان کی کمر قوم کا بہترین سرمایہ ہے۔ لیکن وزیر جلوس نے اپنے جسم کا ہر عضو قوم کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی شخص ان کے درشن سے محروم رہ جائے، آپ نے شاید اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا کہ اگلے مہینے ملک کے مختلف شہروں میں ان کے ایک سو پینتیس جلوس نکالے جائیں گے...... چرا پونجی میں پانچ، پونا میں پندرہ، بنارس میں بیس، مدارس میں پچاس اور بمبئی میں پچپن''۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ ماہ بھی وہ ''ڈنگ ڈانگ'' کے لیے کچھ نہیں لکھ سکیں گے۔

''آئندہ چھوڑ، آئندہ سے آئندہ ماہ بھی وہ لکھنے کے قابل نہ ہوں گے۔ ان جلوسوں کی تھکاوٹ سے ان کی کمر کی جو حالت ہو جائے گی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کمر کے دائمی درد میں مبتلا ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ان جلوسوں کے اختتام پر انہیں کم از کم تین ماہ کے لیے کسی نرسنگ ہوم میں آرام کرنا پڑے گا۔''

''مگر وہ اتنے جلوس کس لیے نکلواتے ہیں۔'' ایڈیٹر نے غیر معمولی جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''ان کا خیال ہے کہ ان کا درشن کر کے بہت سے لوگوں کو ذہنی تسکین ہوتی ہے جس کا احساس ان کی اپنی تسکین کو تقویت پہنچاتا ہے۔''

ایڈیٹر کے پرائیویٹ سیکرٹری سے رخصت چاہی۔

ایک دن بعد وہ وزیر تقریر سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وزیر تقریر نے شکایت کی کہ ''ڈنگ ڈانگ'' بمبئی ان کی تقاریر چھاپنے کی بجائے ان کا مختصر سا خلاصہ چھاپ دیتا ہے۔ ایڈیٹر نے عرض کی'' وزیر تقریر کی تقاریر اتنی طویل ہوتی ہیں کہ اگر انہیں شائع کیا جائے تو شاید ان کے سوا کوئی دوسری چیز چھپ ہی نہ سکے۔ مثال کے طور پر اس نے وزیر موصوف کی تقریر بعنوان اخروٹ کے فوائد کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ دو لاکھ پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل تھی۔ حالانکہ ان میں صرف ایک بات بار بار دہرائی گئی تھی کہ جو قومیں اخروٹ نہیں کھاتیں، وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں۔'' وزیر تقریر نے ایڈیٹر کو مطلع کیا کہ انہوں نے یہ بات دانستہ دہرائی تھی کہ قوم کو ذہن نشین ہو جائے۔

ایڈیٹر نے حرف مطلب زبان پر لاتے ہوئے مضمون کے لیے درخواست کی۔ مضمون کا

نام سنتے ہی وزیر تقریر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا'' آہ مضمون! کاش مجھے تقریروں سے فرصت ملتی اور میں مضمون لکھ سکتا''۔

''لیکن آپ نے وعدہ کیا تھا...... '' ایڈیٹر نے آزمودہ حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا''

''وعدہ! وعدے تو خدا جانے کتنے کیے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا انیس سو بیتس میں، میں نے جمنا کے کنارے وعدہ کیا تھا کہ جب ملک آزاد ہوجائے گا تو تحریر اور تقریر پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جائے گا لیکن آج یہ حالت ہے کہ میرے سوا۔

کسی اور کو آزادی تحریر و تقریر حاصل نہیں۔

بالکل انیس سو چالیس میں میں نے کہا تھا کہ جب ملک آزاد ہوجائے گا تو کنبہ پروری کا خاتمہ کردیا جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے خود اپنے خاندان کے کتنے نااہل افراد......''

''بجا ہے لیکن قسم توڑنے کے لیے ایک آدھ وعدہ تو پورا کیجیے۔ بس ایک چھوٹا سا مضمون......''

''کاش میرے پاس اس کے لیے وقت ہوتا۔ دراصل جب سے ملک آزاد ہوا ہے۔ تقریر کرنے کا کوئی ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ موقع محل دیکھے بغیر تقریر کر ڈالتا ہوں۔ ابھی کل ایک اخبار کے نمائندے نے حساب لگایا کہ اگست پینتالیس سے لے کر جتنی تقریریں میں نے کی ہیں، اگر انہیں کتابی صورت میں چھاپا جائے تو اس سے پچاس انسائیکلوپیڈیا تیار ہوسکتی ہیں۔''

''میرے خیال میں نمائندے نے مبالغہ سے کام نہیں لیا۔''

''بالکل نہیں۔ خاص کر جب اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ ان میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جنہیں سامعین نے سننے سے انکار کردیا۔''

''آپ تقریر بازی سے توبہ کیوں نہیں کرتے؟''

''کرنا چاہتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا۔ تقریر کمبخت بھی شراب کی طرح ہے۔ یعنی۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

''مضمون نہیں تو '' ڈنگ ڈانگ'' کے لیے پیغام ہی عطا فرمائیے''۔

''پیغام؟ میرے پاس کوئی پیغام نہیں ہے۔ وہی جانا پہنچانا پیغام ہے جو میں سیکڑوں بار قوم کو دے چکا ہوں''۔

''یعنی؟''۔

"یعنی اپنے محبوب وزیر تقریر کی تقریریں سنئے۔ تقریریں پڑھئے، تقریریں کھائیے، تقریریں پہنئے، تقاریر میں رہائش اختیار کیجئے۔ اور تقریروں میں اپنی نجات ڈھونڈ ئیے"۔

ایڈیٹر یہ پیغام حاصل کر کے خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے باقی وزراء سے ملنے کا خیال ترک کر دیا۔ "ڈنگ ڈانگ" کے سالنامہ میں اس نے یہ پیغام اس فخریہ نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔

"کہاں ہیں وہ لوگ جو" کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سیاسی تدبر کا دیوالیہ پٹ چکا ہے۔ مندرجہ ذیل پیغام ان لوگوں کی نہ صرف قلعی کھول کر رکھ دے گا بلکہ انہیں سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ آیا ان کا دماغی توازن قائم بھی ہے یا نہیں"۔

☆☆☆

مس چنبیلی

وہ جو شیخ سعدی نے کہا ہے "پیر شو بیا موز" بالکل بجا کہا ہے۔ برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے رہے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ دو چار ایڈیٹروں سے واقفیت ہوگئی اور ان کے تقاضوں نے ناک میں دم کر دیا یا کچھ ادبی قسم کے لوگ، جو ہمیں پہلے ہی سے جانتے تھے اب ذرا اچھی طرح جان گئے۔ اگر کسی ایسی مجلس میں مدعو کیے گئے جہاں شہر کے شرفاء روسا بھی موجود تھے اور کسی شخص نے از راہ ہمدردی ہمارا تعارف ان سے کرایا تو ہمارا استقبال اس قسم کے کلمات سے کیا گیا۔

"مرزا ازبک! کون ازبک کہیں وہی تو نہیں جن کے پان بہت مشہور ہیں۔ اچھا کبھی چونا منڈی سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو ضرور ان کے پان بھی کھائیں گے!"

"اچھا تو یہ ہیں مرزا ازبک، بخدا شکل و صورت سے بالکل ازبک ہی نظر آتے ہیں۔ "مشہور ادیب ہیں! ہم نے ان کا نام پہلی بار سنا ہے"۔

آخر ایک دن جو اپنی گمنامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے، ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔ اول تو ادبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انہیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے۔ چند شعراء اور ادباء جنہیں رسالہ مفت بھجوایا جاتا ہے، یا کالج کے کچھ ذہین طلباء جنہیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے لیکن جو ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے

ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد ہی لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے، چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل ہی میں لکھا کریں گے۔

اتفاق سے پتہ چلتا ہے کہ بمبئی کا مشہور فلمی رسالہ ''فلم باز'' اپنا ایکٹرس نمبر نکال رہا ہے، ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا، عنوان تھا مس چنبیلی سے ایک ملاقات۔ چند دنوں کے بعد ایڈیٹر صاحب کا خط آیا۔ مضمون بہت پسند آیا۔ مبلغ پچاس روپے کا چیک بطور معاوضہ بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی فلم باز کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ ہاں اپنی فوٹو بھی ضرور عنایت کیجئے گا۔

چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں اور بے اختیار منہ سے نکلا، واللہ ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے رہے۔ اگر شروع سے ہی ''فلم باز'' میں لکھتے تو آج خاصے مالدار ہوتے۔ ادبی مضامین کا اس فلمی مضمون سے موازنہ کیا تو پتہ چلا کہ جہاں ایک ادبی مضمون کے لیے گھنٹوں مغز پچی کرنا پڑتی ہے، وہاں ایک فلمی مضمون منٹوں میں لکھا جاتا ہے، مس چنبیلی سے ایک ملاقات ہی کو لیجئے، لکھا ہی کیا تھا ہم نے اس میں...... یہی کہ...... بوٹا سا قد، چھیریرا بدن، خوبصورت ناک نقشہ، مس چنبیلی ہے...... وہ ایک نہایت پراسرار ایکٹرس ہے، اسے کالی بلیوں اور بھورے رنگ کے خرگوشوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ اپنی جلد کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لیے دیسی صابن کا استعمال کرتی ہے۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں کیونکہ وہ ایک تیز چاقو سے انہیں ہر وقت کھرچتی رہتی ہے۔ اسے عطر حنا بالکل پسند نہیں۔ ایک دفعہ اس نے غلطی سے عطر حنا سونگھ لیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ عطر حنا نہیں تھا، کلوروفارم تھا۔ مس چنبیلی عموماً شام کا کھانا صبح اور صبح کا کھانا شام کے وقت کھاتی ہے۔ آلو، ٹماٹر گوبھی اور بینگن کے علاوہ اسے کوئی ترکاری پسند نہیں۔ اسے ہوائی جہاز چلانا بالکل نہیں آتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو بہت اچھا ہوا باز ہو، کھوٹے سکے، خالی بوتلیں اور مٹی کے لوٹے اکٹھا کرنے کا اسے بے حد شوق ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ سا مچ گیا۔ جسے دیکھو فلم باز کا ایکٹرس نمبر، ہاتھ میں لیے مبارک باد دینے چلا آ رہا ہے۔ واہ ازبک صاحب واہ خوب مضمون لکھا ہے، اللہ، لطف آ گیا، کیا انکشافات فرمائے ہیں۔ سبحان اللہ مضمون کیا لکھا ہے، قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک شام ہم پان کھانے کے لیے کتھامل چونامل کی دوکان پر

رکے۔ ہم نے دیکھا کہ دونوں پنواڑی ہمیں دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد کتھامل نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

''تو تم ہی پوچھ لونا شرماتے کیوں ہو''؟

''ہم نے پوچھا کیا بات ہے بھئی''؟

چونامل نے ڈرتے ڈرتے کہا،''جی ایک بات پوچھنا تھی''۔

''کہیئے''۔

''آپ مرزا اجبک ہیں نا؟''

''جی ہاں میں مرزا ازبک ہوں''۔

''ہی ہی ہی۔ بہت اچھا مجمون ہے،ہم نے اپنی دکان میں چنبیلی ہی کی تصویریں لگا رکھی ہیں''۔

ہم نے دیکھا کہ اس کی دکان میں واقعی چنبیلی نظر آتی ہے۔ پیسے دینے کے لیے بٹوہ نکالا ہی تھا کہ کتھامل نے ہمیں منع کرتے ہوئے کہا۔

''نا صاحب نا ایسا نہ کیجئے ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے''۔

''لیکن کیوں۔ہم نے حیران ہو کر پوچھا''۔

''اجی رہنے دیجئے،آپ اتنے بڑے آدمی مس چنبیلی کو جانتے ہیں آپ سے بھلا کیسے پیسے''۔

بہت اصرار کیا لیکن وہ نہ مانا بلکہ کہنے لگا''آئندہ بھی جب کبھی پان کا شوق فرمانا ہو،تو ہمیں یاد فرمائیے گا''۔

پان چباتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک ایک حوالدار نے ہمیں پکار کر کہا۔

''اجی ازبک صاحب''

''ذرا ٹھہریئے تو''۔

حوالدار کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ خدا خیر کرے کہیں اس کے پاس ہماری گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں ہے۔ کہیں اس کو ہم پر جیل سے بھاگے ہوئے کسی مجرم کا شبہ تو نہیں ہوا۔

حوالدار صاحب نے کہا''میں پرسوں سے آپ کی تلاش کر رہا ہوں،اچھا ہوا آپ اتفاقاً مل گئے''۔

''لیکن حوالدار صاحب ہم نے...... ہمارا مطلب ہے...... کہ''۔

''اجی ازبک صاحب'' حوالدار صاحب نے ہماری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا،

''آپ نے تو کمال کر دیا۔ وہ مضمون جو آپ نے لکھا ہے چنبیلی پر بخدا چار دفعہ پڑھ چکا ہوں اور اتنی بار اور پڑھنے کا ارادہ ہے۔''

مضمون کا ذکر سن کر جان میں جان آئی۔ وہ فرمانے لگے، ''آیئے ناذرا غریب خانے تک چائے پئیں گے اور ساتھ ہی آپ سے مس چنبیلی کے بارے میں کچھ اور تفاصیل سنیں گے''۔

میرے انکار کے باوجود مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ چائے پینے کے دوران میں پوچھنے لگے ''ازبک صاحب یہ جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کیا ایک بار مس چنبیلی نے ایک چور پکڑا تھا کیا یہ درست ہے؟''

''جی ہاں یہ بالکل درست ہے''۔

''لیکن وہ چور کون تھا؟''۔

''چور کہاں تھا، قبلہ وہ تو ایک فاقہ زدہ شاعر تھا''۔

''فاقہ زدہ شاعر؟''

''جی ہاں بے چارہ گھر سے بمبئی آیا تھا کہ فلموں کے گانے لکھے گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ بمبئی میں واقفیت کے بغیر کام کہاں ملتا ہے۔'' ''ایک مہینے اسٹوڈیوز کی خاک چھانتا رہا۔ اس اثناء میں جو پونجی گھر سے لایا گیا تھا ختم ہوگئی۔ آخر ایک دن اس نے چوری کرنے کی ٹھانی......ایک کندسی تلوار لے کر رات کے ایک بجے مس چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوا''۔

''پھر؟''

اچانک مس چنبیلی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں اٹھ کھڑی ہوئی اور شاعر کی انکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی، آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں شوق سے کیجئے۔ ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

دراصل یہ ایک فلم کا ڈائیلاگ تھا جو مس چنبیلی کو بر وقت یاد آ گیا۔ بس صاحب شاعر نے جب یہ ڈائیلاگ سنا تو عشق عشق کرنے لگا تلوار اس کے ہاتھوں سے گر پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ع

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مس چنبیلی نے کمال صفائی سے وہ کند تلوار اٹھائی اور شاعر پہ وار کیا۔ بھوک سے تو وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ فوراً زمین پر آ رہا۔ مس چنبیلی نے گھنٹی بجائی اور اس کے پٹھان ملازم نے شاعر کی مشکیں کس دیں اور صبح اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا''۔

''خوب کمال کی دلیری دکھائی مس چنبیلی نے''۔

''جی ہاں''۔

''اچھا آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ مس چنبیلی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی''۔

''وہ کیا قصہ تھا؟ صاحب یہ قصہ ذرا طویل ہے پھر کبھی عرض کروں گا اب اجازت چاہتا ہوں''۔

رات کے وقت جب گھر لوٹے تو ہمارے ہمسائے ڈاکٹر منو ہر لال صاحب تشریف لائے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے ''قبلہ ازبک صاحب آپ تو چھپے رستم ہیں۔ یہ آپ نے لکھنا کب شروع کیا ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ محض معلم ہیں لیکن آپ تو اچھے خاصے ادیب ہیں''۔

''قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ ادیب تو کیا ہوں یوں ہی مشغلے کے طور پر کبھی کبھار لکھا کرتا ہوں''۔

''اچھا ازبک صاحب، یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مس چنبیلی صبح کا کھانا شام کو اور شام کا کھانا صبح کو کھاتی ہے، اس سے مس چنبیلی کو بدہضمی کی شکایت تو نہیں ہو جاتی ہے''۔

قبلہ یہ سب عادت پر منحصر ہے۔ عادت اور مشق پر ہمارا تو خیال ہے کہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی مشق کر لے تو کچھ عرصے کے بعد اسے صبح اور شام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔

''بہر حال میڈیکل نقطہ نگاہ سے''۔

''میڈیکل نقطہ نگاہ کو رہنے دیجئے۔ یہ فلم لائن ہے اس میں سب کچھ چلتا ہے''۔

چند دنوں کے بعد ایک عطار کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجا لانے کے بعد کرسی پیش کی اور کہنے لگے، ''ازبک صاحب ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے بڑے ادیب ہیں ورنہ یہ گستاخی کبھی نہ ہوتی''۔

''کون سی گستاخی قبلہ!''۔

''پچھلے دنوں آپ شربت بنفشہ لینے آئے تھے اور ہم نے آپ سے پیسے لے لیے تھے''۔

''اس میں تو کوئی گستاخی نہیں، آخر پیسے تو آپ......''

''نہیں صاحب یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ خیر اس کی تلافی آج کر دی جائے گی، شربت بنفشہ ہی چاہیے نا آپ کو!''۔

''جی ہاں چار تولے دے دیجئے''۔

''تولوں کا حساب چھوڑیئے ازبک صاحب، آپ بوتل ہی لیجئے...... ارے بھئی خیراتی لال ازبک صاحب کو شربت بنفشہ درجہ خاص کی ایک بوتل لا دو''۔

''لیکن قبلہ مجھے بوتل نہیں چاہیے''۔

''جی صاحب ہماری طرف سے ناچیز تحفہ سمجھ کر لے جایئے واہ واہ کیا مضمون لکھا ہے آپ نے''۔

بوتل پیش کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ مس چنبیلی کے غائبانہ مداح ہیں ''فلم باز'' کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور صرف یہی ایک رسالہ ہے جسے ان کی دکان پر باندھنے کے کام میں نہیں لایا جاتا۔

ان کا شکریہ ادا کر کے گھر پہنچا تو چند فلم زدہ لڑکیاں وارد ہوئیں۔ بے چاری بے حد پریشان تھیں اور میری راہنمائی چاہتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ اگر میں ایک کالی بلی مس چنبیلی کو بھجوا دوں تو کیا وہ اسے قبول کرے گی؟...... دوسری کے پاس کھوٹے سکوں کا ذخیرہ تھا۔ وہ اسے مس چنبیلی کی نذر کرنا چاہتی تھی...... تیسری یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ مس چنبیلی کون سا دیسی صابن استعمال کرتی ہے؟...... ان سب کو مناسب مشورے دیئے گئے اور وہ خوش و خرم رخصت ہوئیں۔

اس دن ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب کا خط ملا کہ وہ فانی بایونی پر ایک خاص نمبر نکال رہے ہیں۔ اس لیے انہیں ایک مضمون بہ عنوان ''فانی کی شاعری پر شوپن ہار کا اثر'' لکھ کر بواپسی ڈاک بھجوائیں۔ ہم نے انہیں جواب میں جو خط لکھا وہ سننے کے قابل ہے۔

''محترمی...... غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ ادبی مضامین سے مدت سے ثابت ہو چکا ہے میرے خیال میں یہ سراسر تضیع اوقات ہے۔ نیز مالی لحاظ سے سخت خسارے کا سودا ہے۔ اگر مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا شوق ہوا تو میں خود ہی لوں گا۔ رسالہ بھی نہیں بھجوائیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین لکھوں گا۔ پچاس روپے معاوضہ ملتا ہے، کھانے کو پان اور پینے کو شربت بنفشہ مفت مل جاتا ہے۔ نیز ہمسائے سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بہت بڑے ادیب ہیں صاف گوئی

کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میری طرف سے اپنی رسالے میں یہ اعلان شائع فرمادیں کہ آئندہ کوئی ادبی رسالہ مجھ سے ادبی مضمون کا تقاضہ نہ کرے۔ فقط''۔

☆☆☆

جمود

جب متواتر آٹھ سال یہ سنتے دم ناک میں آ گیا کہ ہندوستانی ادباء پر جمود بری طرح مسلط ہو گیا ہے اور وہ ادب میں اضافہ کرنے سے قاصر ہیں، تو یونہی ایک دن شوق چرایا کہ اس جمود کے اسباب دریافت کیے جائیں۔ حسن اتفاق سے محلے میں ایسے لوگ رہائش پذیر تھے جنہیں مکان کا کرایہ ادا کرنے کی توفیق اکثر کم ہوتی تھی لیکن جنہیں اہل قسم کے خطاب سے نوازا جاتا ہے چنانچہ ہم نے جناب خشک راہستانی کے دولت خانے کا رخ کیا۔ جناب خشک دودھ اور چینی کے بغیر ایک چائے کا پیالہ نوش فرمانے میں مصروف تھے۔ آداب بجا لائے۔ لانے کے بعد عرض کیا میں ایک خاص کام سے حاضر ہوا ہوں۔

''فرمائیے جناب'' خشک صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''ایک زمانہ تھا خشک صاحب کہ آپ کے کلام کی دھوم تھی اور آپ کے تکیہ کلام ''عرض کیا ہے'' سے دوست دشمن پناہ مانگتے تھے۔ لیکن اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ کیا اس انقلاب پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے''۔

سوال ملاحظہ فرمانے کے بعد جناب خشک نے اپنے سینے پر زور سے ایک دوہتھڑ مارا۔ پھر چھت کی طرف دیوانہ وار نظریں دوڑائیں اور چیخنے کے سے انداز سے بولے۔

''ظالم! یہ تم نے کس دور کی یاد دلائی۔ آہ واقعی کیا زمانہ تھا، وہ بھی غزلیں ہیں کہ ساون کی گھٹاؤں کی طرح امڈی چلی آتی ہیں، قافیے ہیں کہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں لیکن اب تو یہ حال ہے کہ بقول شاعر۔ ع

مدت ہوئی ہماری منقار وزیر پر ہے

مہینوں فکر سخن کرتا ہوں، لیکن ایک مصرعہ نہیں ہوتا''۔

''یہ تو آپ بجا فرما رہے ہیں۔ لیکن وجہ؟''

''وجہ ارے بھئی وہ جمود ہی تھا جو یہ سوچنے کی مہلت یا اجازت دے کہ اس کے طاری

ہونے کی وجہ کیا ہے‘‘۔

’’تو گویا آپ پر بیٹھے بٹھائے جمود نے حملہ کر دیا‘‘۔

’’جی ہاں اور کچھ اس شدت سے کہ دماغ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ختم ہو گئے‘‘۔

’’لیکن اس حیرت ناک بلکہ عبرتناک تبدیلی کی کچھ وجہ تو ہو گی۔ آپ کو کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کرنا چاہیے تھا‘‘۔

’’کر چکا ہوں صاحب، کر چکا ہوں ایک نہیں تین بار‘‘۔

’’تو کیا کہا اس نے؟‘‘۔

’’کہنے لگا تمہیں لاشعور میں گڑبڑ ہے‘‘۔

’’لاشعور میں گڑبڑ!‘‘۔

’’ہاں معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں جب ہم نے پہلا شعر کہا تھا تو نرس نے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ ساتھ ہی تنبیہہ کی تھی کہ شریف زادے رومانی اشعار نہیں کہا کرتے‘‘۔

’’اگر یہ بات ہے تو آپ اتنے برس شاعری کس طرح کرتے رہے‘‘۔

’’ممکن ہے لاشعور کو نرس کی ڈانٹ بعد میں یاد آئی ہو‘‘۔

’’آپ کے خیال میں آپ پر جمود کب تک طاری رہے گا‘‘۔

’’کچھ کہہ نہیں سکتے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے عمر بھر اس کم بخت سے نجات نہ ملے گی‘‘۔

’’عمر بھر‘‘۔

جی ہاں میں تو کئی بار اس سے عرض کر چکا ہوں۔

بہت دن رہے حضرت غم یہاں
کرم کرتے اب اور گھر دیکھئے
لیکن یہ ٹلنے کا نام نہیں لیتا‘‘۔

خشک صاحب سے اجازت لے کر ہم جناب اجاڑ شکارپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

’’اجاڑ صاحب! آپ بھی جمود کے مرض میں مبتلا ہو گئے‘‘ ہم نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

’’بات تو کچھ ایسی ہی ہے‘‘۔

''لیکن معاملہ کیا ہے، ہمارا مطلب ہے آپ تو بھلے چنگے ہوا کرتے تھے''۔

''آپ کا ارشاد شاید ماضی بعید کی طرف ہے''۔

''بجا فرما رہے ہیں آپ''۔

''دراصل میں واقعی بھلا چنگا ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب دو سال سے کچھ''۔

''ہاں ہاں کچھ؟''۔

''چکر میں ہوں''۔

''کون سے چکر ہیں؟''

''بات دراصل یہ ہے کہ جب میری طویل نظم ''ابابیل سے عقاب تک'' شائع ہوئی تو ایک نقاد نے کہا کہ میں اردو ادب کا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ہوں۔ دوسرے نے فتویٰ دیا میں ڈبلیو، ایچ، آڈن ہوں۔ اب میں ہر وقت یہ سوچتا ہوں کہ میں ایلیٹ ہوں یا آڈن، آڈن ہوں یا ایلیٹ''۔

''آپ کو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ظاہر ہے کہ آپ اجاڑ شکار پوری ہیں اس لیے اس چکر سے نکلئے اور کچھ لکھئے''۔

''وہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اگر ایک آدمی صرف ایک طویل نظم لکھنے کے بعد ٹی ایس۔ ایلیٹ یا ڈبلیو ایچ آڈن بن جائے تو پھر اسے زیادہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

''تو گویا آپ کے جمود کی ذمہ داری نقاد حضرات پر عائد ہوتی ہے''۔

''درست فرماتے ہیں آپ''۔

اب ہم نے مشہور افسانہ نویس جناب بنجر صحرائی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو بنجر صاحب کے ملازم سے معلوم ہوا کہ موصوف عرصے سے مراقبے میں ہیں، پڑھنا لکھنا ترک کر رکھا ہے، ہر وقت غالب کے مصرعے دہراتے رہتے ہیں۔

اب اللہ ہی اللہ ہے۔ بڑی مشکل سے انہیں مراقبے سے باہر آنے پر مجبور کیا، اور اس سے پیشتر وہ پھر مراقبے میں چلے جاتے ہیں، سوال داغ دیا۔

''بنجر صاحب یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے افسانہ نویسی سے توبہ کیوں کر لی؟''

بنجر صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا ''یہ سب میرے اعصاب کا قصور ہے''۔

''اعصاب کا؟ خدانخواستہ آپ کسی اعصابی مرض میں تو مبتلا نہیں ہو گئے ہیں''۔

''نہیں یہ بات نہیں۔ دراصل میں تب تک افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ جب تک میرے اعصاب پر کوئی نہ کوئی چیز سوار نہ ہو جائے۔ شروع میں بقول اقبال عورت سوار تھی۔ چنانچہ میں نے عورت کی زلف سے لے کر ٹخنے تک ہر موضوع پا افسانے لکھ ڈالے۔ جب عورت نیچے اتری تو فرائیڈ سوار ہو گیا۔ اب میں نے شعور اور لاشعور کی بھول بھلیاں پر جو لکھنا شروع کیا تو دوسروں کی بات الگ رہی، خود میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ لکھ کیا رہا ہوں۔ فرائیڈ صاحب رخصت ہوئے تو کارل مارکس تشریف لے آئے اور لپک کر سوار ہو گئے۔ اب دن رات بھونچال، ہڑتال، سرخ سویرا، سرخ دوپہر، سرخ ستارے ایسے موضوعات پر لکھنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد جب کارل مارکس تشریف لے گئے تو اعصاب کی کرسی خالی ہو گئی۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ کوئی شخص آئے اس کرسی پر بیٹھے اور میں لکھنا شروع کروں''۔

''کب تک انتظار کیجئے گا۔ ہمت سے کام لے کر کسی موضوع پر لکھ کیوں نہیں ڈالتے''۔

''جی حضرت یہی تو مصیبت ہے موضوعات ہی ختم ہو گئے، لکھوں کس پر؟''

''آخر موضوعات کس طرح ختم ہو سکتے ہیں''۔

''آپ نے شاید گھوڑی کے ختم ہو جانے والا قصہ نہیں سنا''۔

''وہ کیا ہے سنا دیجئے''۔

''کوئی مسخرا پہلی بار گھوڑی پر سوار ہوا اور تھوڑی دیر میں زمین پر آ رہا۔ جناب نے پوچھا۔ بات کیا ہوئی۔ کہنے لگا یہ سب گھوڑی کا قصور ہے، پہلی بار جب وہ اچھلی تو وہ اس کی گردن پر آ گرا۔ دوسری بات اچھلی تو میں اس کے کانوں پر بیٹھا ہوا نظر آیا، تیسری بار اچھلی تو میں زمین پر تھا، جب گھوڑی ہی ختم ہو گئی، تو اس پر بیٹھے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

''بہت خوب آپ کا طرز استدلال لاجواب ہے''۔

بنجر صاحب سے رخصت ہو کر ہم فضول بٹالوی کے ہاں پہنچے۔

''فضول بٹالوی صاحب''۔ ہم نے بڑے ادب سے کہا۔ ''جمود کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے''۔

''جمود'' فضول بٹالوی نے چلا کر کہا۔ ''کہاں ہے جمود، کدھر ہے جمود، کیسا جمود؟''

بڑی انکساری سے عرض کیا۔ ''غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ ادباء پر جمود طاری ہو گیا ہے''۔

''یہی......یہی اپنے ہندوستانی ادباء پر''۔

''آپ سے کس نے کہا؟''۔

''اجی کہنا کس نے تھا۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے''۔

''بالکل غلط۔ یہ جمود ہرگز نہیں ہے''۔

''کیسے؟''۔

''دیکھئے خاکسار نے صرف پچھلے پانچ مہینوں میں پانچ ناول، پچیس افسانے اور پچاس مضامین لکھے۔ ان تخلیقات کی موجودگی میں آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادباء پر جمود طاری ہے''۔

''آپ نے یہ سب کچھ کیسے لکھ لیا''۔

''یہ میرا تجارتی راز ہے، یہ میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں''۔

''پھر بھی باقی ادباء کی رہنمائی کے لیے اگر ایک آدھ اشارہ......''۔

''مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ یہ پھل میرے خامے بسم اللہ کی برکت ہے۔ مثلاً میں نے ایک ناول لکھا ''پیاری دلہن'' کوئی دوسرا ادیب ہوتا تو اسے لکھنے کے بعد صبر یا آرام کرتا لیکن میں نے فوراً دوسرا ناول شروع کر دیا۔ ''دلاری دلہن'' اور پھر ''ہماری دلہن'' حتیٰ کہ ''کنواری دلہن'' جب یہ سلسلہ بفضل خدا ختم ہوا تو میں نے ایک اور سلسلہ شروع کر دیا۔ ''رات کی رانی'' ''برسات کی رانی'' ''جذبات کی رانی'' اور ''واردات کی رانی'' علیٰ ہذ القیاس۔

''تو آپ کے خیال میں جمود نام کی کوئی چیز نہیں''۔

''جمود کہاں ہے، قبلہ یہ تو دماغی خشکی ہے، حکماء نے اس کا علاج بادام روغن بتایا ہے''۔

''گویا جن ادباء کو جمود کی شکایت ہے، انہیں بادام روغن کی اشد ضرورت ہے''۔

''بادام روغن کے علاوہ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے، اور وہ ہے''۔

''ہاں ہاں وہ کیا ہے؟''۔

''وہ ہے گوند''۔

''گوند کیا مطلب؟''۔

''دیکھئے جب تک ادیب اپنی کرسی پر گوند لگا کر اس پر نہ بیٹھے وہ جم کر بیٹھ نہیں سکتا''۔

''سبحان اللہ کیا لاجواب نسخہ ہے۔ بادام روغن اور گوند''۔

''جی ہاں۔ ادباء سے کہئے کہ گوند اور بادام روغن کا باقاعدہ استعمال کریں۔اگر جمود کا بھوت دم دبا کر نہ بھاگ جائے تو فضول بٹالوی نام نہیں''۔

فضول بٹالوی سے رخصت ہو کر ہم جب گھر لوٹے تو خدا کا شکر بجالائے کہ گو جمود کے اسباب دریافت نہیں کر سکتے کم ازکم اس کے علاج کا تو پتا چل گیا۔اب یہ دوسری بات ہی کہ جناب فضول بٹالوی کے نسخے پر عمل کرنے سے اعلیٰ ادب کی تخلیق ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ بہر حال یہ نہ لکھنے سے کچھ لکھنا بہتر ہے...... ''بال جبریل'' اور ''چوگان ہستی'' نہ سہی ''کنواری دلہن'' اور ''برسات کی رانی'' ہی سی!

☆☆☆

نور کا تڑکا ہوا

رات کی پانچ بجے ہمسائے کے ٹائم پیس کا الارم بجا۔اس کو تو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ وہ ہمیشہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے حالانکہ گھوڑوں کا بیوپاری نہیں،لیکن ہماری نیند اچاٹ ہوگئی۔اب کباب سیخ کی طرح کبھی یہ پہلو اور کبھی وہ پہلو بدلتے ہیں لیکن نیند نے گویا نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے۔یاد آیا کہ بزرگوں نے کہا ہے نور تڑکے سیر کی جائے تو آدمی سارا دن چاق و چوبند رہتا ہے۔بستر سے اٹھے اور بجلی کا بٹن دبا دیا۔بجلی غائب تھی،اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار کر بوٹ کی بجائے چپل اور کوٹ کی بجائے واسکٹ پہن کر گھر سے چل نکلے۔

باہر آئے تو عجب سماں تھا۔چوطرفہ مرغوں کی اذانیں تھیں۔فٹ پاتھ پر سوئے لوگ خراٹے لے رہے تھے اور کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔چند قدم اور چلے کہ دو کتے ''صبح بخیر'' کہنے کے لیے ہماری طرف لپکے،گھبراہٹ کے عالم میں کچھ نہ سوچا کہ ان کا خیر مقدم کیسے کیا جائے۔ان میں سے ایک ذرا زیادہ بے تکلف واقع ہوا تھا کہ مصافحہ کرنے کی بجائے بغلگیر ہونا چاہتا تھا،ہم نے صدقہ اتارنے کے لیے دائیں چپل اتاری۔وہ چپل کو دانتوں میں داب کر چلتا بنا۔ دوسری چپل ہم نے دوسرے کتے کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا یہ آپ کی نذر ہے۔

ننگے پاؤں سڑک پر چلنے لگے۔سوچا کہ کیا مضائقہ ہے اور پھر ابھی اتنا اندھیرا ہے کہ کسی کو معلوم ہے کب ہوگا ہم سے چند گز کے فاصلے پر کچھ لوگ خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔لمبے

لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہم ان سے جا ملے۔ ان میں سے دو ایک شناسا نکلے۔ ہمیں دیکھ کر گویا بجلی سی گری۔ کہنے لگے ''ارے ارے آپ! واقعی آپ ہی ہیں؟ کہئے حضرت آج کیسے سیر کو چلے آئے؟ آپ تو دس بجے سے پہلے بستر نہیں چھوڑتے، خیریت تو ہے''۔ ہم نے معذرت کے انداز میں جواب دیا ''یونہی آج غلطی ہوگئی۔ سخت شرمندہ ہوں، آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا''۔ دو ایک منٹ ہمیں تختہ مشق بنانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے چہلیں کرنے لگے ''کیوں صاحب'' ایک نے کہا سیر کرنے کو تو آپ روزانہ آتے ہیں لیکن آپ کی توند گھٹنے کی بجائے بڑھتی جارہی ہے، کس چکی کا پسا کھاتے ہو''۔ دوسرے نے جواب دیا۔ ''اجی آپ ہماری توند کی فکر میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ ننانوے کے پھیر سے نکلئے اور کچھ کھایا پیا کیجئے'' اس تمہید کے بعد جو دلچسپ باتیں ہوئیں وہ اس قسم کی تھیں۔

''کہیئے خارش کا کیا حال ہے'' ''ایک پل چین نہیں لینے دیتی''۔

''جوڑوں کے درد سے کچھ آفاقہ ہوا! اجی کہاں ہڈی ہڈی دکھتی ہے''۔

''آپ کی آنکھوں کا کیا حال ہے۔ جب سے آپریشن کرایا ہے، نگاہ کمزور ہوگئی ہے۔ سنا ہے آپ نے بھینس فروخت کردی ہے۔ جی ہاں اب مرغیاں پالنے کا خیال ہے''۔

''پیاز اوپر جارہے ہیں، سٹاک کرنے کا بہت اچھا موقع ہے''۔

''آپ کی پاس کھٹی ڈکاروں کا نسخہ ہے، وہ ہمیں بھی دے دیجئے''۔

اس ادبی گفتگو کی تاب نہ لاکر ان سے اجازت لی اور آگے دفتروں میں کام کرنے والے کچھ بابو سیر کررہے تھے، سوچا کہ ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ان کی باتیں سن کر طبیعت اور بھی باغ باغ ہوگئی۔ وہ سب اپنے اپنے سپرنٹنڈنٹ سے بیزار نظر آرہے تھے اور طرح طرح کے القاب سے اسے یاد کررہے تھے۔

''پاگل۔ گھامڑ ہے، صاحب بات کرنے کی تمیز نہیں''۔

''خدا جانے کون سے اصطبل میں پڑھتا رہا ہے''۔

''اجی باؤلا کتا ہے بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا ہے''۔

''ایک دم پاگل ہے، اسے تو رانچی کے پاگل خانے میں بھجوانا چاہیے''۔

''کل ہی صرف دو گھنٹے لیٹ آئے اور ہماری جواب طلبی ہوگئی، بھلا یہ بھی انصاف

ہے۔شرما صاحب کے زمانے میں ہم تین تین گھنٹے لیٹ آیا کرتے تھے۔مجال ہے جوانہوں نے کبھی کچھ کہا ہو‘‘۔

’’اجی کیابات تھی شرما صاحب کی ، وہ تو دیوتا تھے،خود کبھی کبھی اس وقت دفتر آیا کرتے تھے جب دوسرے دفتر سے گھر لوٹ رہے ہوتے ہیں‘‘۔

ان سے آگے بڑھے تو سڑک کے کنارے ایک باغ نظر آیا۔جی میں،کوئی مرغان سحر کی وجد اور موسیقی کی تعریف تو کتابوں میں بہت پڑھی لیکن سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیں۔ باغ میں داخل ہوئے ، درختوں پر سیکڑوں پنچھی بیٹھے ہوئے طلوع آفتاب کا خیر مقدم کرر ہے تھے۔غور سے ان کا گانا سننے لگے،خدا جانے بھیرویں گا رہے تھے یا کوئی اور صبح کا راگ تھا۔ایک لامتناہی بے ہنگم شور تھا۔اگر استھائی اس بول پر مشتمل تھی ، چوں چوں ٹرپ ٹی ہوں، ٹیں ٹیں ٹاں،تو انترہ کے بول تھے۔ٹیں ٹیں ٹاپ ٹپ ٹپ۔ٹراپ ٹراپ چواں‘‘۔

باغ میں کھیتوں کا راستہ لیا۔ایک کنویں پر پہنچے وہاں چھوٹی کیاریوں میں پیاز اور لہسن لہلہاتے نظر آرہے تھے،ان کا نظارہ کرر ہے تھے کہ ایک ہوا کا جھونکا، بولہسن اور پیاز کی بو سے بوجھل ہورہا تھا ہمارے نتھنوں سے ٹکرایا۔چھینکوں کا تانتا سابندھ گیا۔چھینکتے چھینکتے بے حال سے ہو گئے تو کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔دوایک منٹ بعد چھینکیں رک گئیں۔خدا کا شکرادا کیا کہ زکام میں مبتلا ہونے سے بال بال بچ گئے، بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ کنوئیں میں جھانک کر دیکھا جائے کہ اس کی تہہ کہاں ہے جونہی کنوئیں میں جھانکنے کی کوشش کی،ایک زوردار چھینک آئی اور عینک ناک سے لڑھک کر کنوئیں میں جارہی۔عینک کی فاتحہ پڑھی اور گھر لوٹنے کا ارادہ کیا۔

گھر پہنچے تو شریمتی جی نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔’’یہ آپ ننگے پاؤں کہاں سے آرہے ہیں؟ عینک کہاں ہے، ناک کیوں سرخ ہورہی ہے؟ کھوئے کھوئے کیوں نظر آرہے ہیں؟ واسکٹ الٹی کیوں پہن رکھی ہے‘‘ہم نے ان تمام سوالوں کے جواب میں کہا۔

’’بھاگوان‘‘ یہ سب نور کے تڑکے کی برکت ہے‘‘۔

سارادن دفتر میں اونگھتے رہے،بعض کلرکوں کا تو بیان ہے کہ بارہ بجے سے تین بجے تک ہم اپنی کرسی میں سوئے پائے گئے ،شام کو جب گھر لوٹے تو سیدھے ہمسائے کے گھر پہنچے اور بڑی عاجزی سے کہا’’ورما صاحب، یہ آپ نے ٹائم پیس تو خرید لیا لیکن اس سے فائدہ کبھی نہیں اٹھایا‘‘۔ میں

آپ کا مطلب نہیں سمجھا'' مطلب یہ کہ الارم تو آپ لگاتے ہیں لیکن اٹھنا مجھے پڑتا ہے''۔

''لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں''۔

''علم کس طرح ہوسکتا ہے آپ تو اس وقت خراٹے لے رہے ہوتے ہیں، اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں'' ''کہیے'' ''آپ یہ ٹائم پیس مجھے فروخت کر دیں'' کافی بحث وتکرار کے بعد ورما صاحب ٹائم پیس فروخت کرنے پر رضا مند ہو گئے، ہم ٹائم پیس خرید کر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ گھر آتے ہی ہم نے اسے سیف میں رکھ تالا لگایا کہ نہ کم بخت صبح کے پانچ بجے چلائے گا اور نہ نور کا تڑکا ہوگا۔

☆☆☆

دیسی فرنگی کا دربار!

یہ بات تو نہیں تھی کہ دیسی فرنگی نے اپنی کوٹھی کے باہر مغل شہنشاہ جہانگیر کی طرح کوئی زنجیر عدل لٹکا رکھی تھی جس کے کھینچنے پر سونے کی گھنٹیاں بجتیں اور اسے پتا چل جاتا کہ نیچے فریادی کھڑا ہے۔ ہاں اس نے ریڈیو پر اور اخباروں میں اعلان ضرور کر دیا تھا، کہ کوئی بھی شخص مہینے کی پچیس تاریخ کو اس سے مل سکتا ہے۔ آج چونکہ ملاقاتیوں سے ملنے کا دن تھا، اس لیے اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے صبح کے نو بجے پوچھا ''ٹوڈی رام! جانتے ہو، آج کے دن کی کیا اہمیت ہے؟''

''ان داتا!'' ٹوڈی رام نے جواب دیتے ہوئے کہا ''اچھی طرح جانتا ہوں''۔

''آج آپ سے جنتا ملنے آ رہی ہے''۔

''ان داتا'' کی ترکیب پر دیسی فرنگی نے ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے کہا ''ٹوڈی رام! تمہیں سو بار سمجھایا ہے ہمیں ان داتا مت کہا کرو۔ اس سے غلامی کی بو آتی ہے''۔

''اگر ان داتا نہ کہوں تو اور کیا کہوں'' ٹوڈی رام نے بھولپن سے پوچھا۔

''درجنوں تراکیب ہیں''۔

''مثلاً؟''۔

''ملازمت داتا۔ صدارت داتا۔ سفارت داتا وغیرہ وغیرہ''۔

''بہت اچھا۔ ملازمت داتا''۔

''ٹوڈی رام، ہمیں آج تمہاری اخلاقی حمایت کی خاص ضرورت ہے کیونکہ بہت سے لوگ ہم سے ملاقات کرنے کے لیے آ رہے ہیں''۔

''آپ کا مطلب شاید'' مارل سپورٹ'' سے ہے''۔

''تم ہمارا مطلب ٹھیک سمجھے''۔

ٹوڈی رام نے اٹھ کر الماری سے سکاچ وسکی کی بوتل نکالی۔ ایک ڈبل پیگ گلاس میں انڈیلا اور دیسی فرنگی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ملازمت داتا! اس سے بہتر'' مارل سپورٹ'' سکاٹ لینڈ آج تک تیار نہیں کر سکا''۔ دیسی فرنگی نے پیگ کو حلق سے نیچے اتارا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور ٹوڈی رام سے پوچھا۔ ''ہاں۔ تو وہ سب کتابیں جن میں عامیانہ اقوال، نصیحت آمیز اشعار اور حکایات درج ہیں، ہماری میز پر رکھ دی گئیں ہیں''۔

''جی ہاں''۔

''وہ امریکن کتاب بھی جو تم نے کل ہمارے لیے خریدی تھی، کیا نام تھا اس کا؟''

''اس کا نام ہے'' جنتا کو الو بنانے کا فن'' مصنف ہیں کیل ڈرانیکی''۔

''ہاں ہاں کیل ڈرانیکی! بڑا زندہ دل مصنف ہے، اس نے وہ کتاب بھی لکھی ہے نا''۔

''کیا نام ہے اس کا''۔

''حضور اس کا نام ہے لومڑ اور سیاستدان''۔

''ہاں بالکل یہی نام ہے خوب لکھتا ہے ظالم''۔

''اس میں کوئی شک نہیں''۔

''اچھا تو اب ہم بالکل تیار ہیں۔ دربان سے کہو کہ ملاقاتیوں کو ایک ایک کر کے اندر بھیجے''۔

سب سے پہلے ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ دیسی فرنگی نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پوچھا۔ '' کہیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں''۔

''حضور! میں ایک نہایت بد قسمت باپ ہوں۔ میرے اکلوتے لڑکے کو تپ دق ہو گیا ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ اس کا علاج کرا سکوں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ اگر وہ جانبر نہ ہو سکا تو میں تباہ ہو جاؤں گا''۔

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں'' دیسی فرنگی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ '' پہلے یہ

بتایئے آپ ہندو ہیں یا نہیں؟''

''ہندو ہوں''۔

''بھگوت گیتا کا مطالعہ کیا ہے؟''۔

''جی ہاں''۔

''جانتے ہو، اس کے دوسرے باب میں کیا لکھا ہے؟''۔

''یہ کہ روح غیر فانی ہے''۔

''جی ہاں''۔

''تو پھر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ دیکھو یہ ظاہر ہے یا تمہارا لڑکا بچ جائے گا یا مر جائے گا۔ اگر بچ گیا تو تمہیں خوشی ہوگی اور اگر مر گیا تو تمہیں غم ہونا چاہیے کیونکہ روح غیر فانی ہے''۔

''آپ ٹھیک فرماتے ہیں''۔

''یہ ہم نہیں فرماتے بھگوان کرشن کا ارشاد ہے۔ اچھا آداب عرض''۔

''دوسرا ملاقاتی ایک شاعر تھا۔ بال بڑھے ہوئے، لباس میلا، چہرہ کملایا ہوا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' دیسی فرنگی نے پوچھا۔

''جناب میں ایک غریب شاعر ہوں۔ سرسوتی کا پجاری۔ خوبصورت نظمیں لکھتا ہوں۔ لیکن دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ جب سے پیدا ہوا ہوں۔ غم سے نجات نہیں ملی''۔

''شاعر ہو کر ایسی غیر شاعرانہ باتیں کرتے ہو''۔ دیسی فرنگی نے طنز آمیز لہجے میں کہا ''غم تو اللہ کی دین ہے۔ تم نے وہ شعر نہیں سنا۔

خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غم جاوداں نہیں ملتا

غم ہی تو شاعر کی سب سے بڑی دولت ہے، اگر یہ نہ ہو تو بقول اصغر گونڈوی ''زندگی دشوار ہو جائے''۔

غالب کی مثال تمہارے سامنے ہے، کیا خوب کہہ گئے ہیں۔

رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غم کی سیاہی ہی میں تو شاعر کا جوہر کھلتا ہے، تمہیں تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ تم غم سے اپنی گلوخلاصی نہیں کرا سکے۔ اچھا تم جا سکتے ہو"۔

شاعر رخصت ہوا۔ اب ایک عیسائی عورت اندر آئی۔ اس نے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "میں ایک بیوہ ہوں۔ خاوند کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ خدا کے علاوہ کوئی سہارا نہیں۔ میری کچھ مدد کیجیے"۔ دیسی فرنگی نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری دردناک داستان سن کر بہت دکھ ہوا لیکن اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟" "پوچھیے"۔

"تمہیں معلوم ہے، حضرت یسوع مسیح نے غربت کے بارے میں کیا لکھا ہے"۔

"یاد نہیں"۔

"یسوع نے فرمایا۔ مبارک ہیں وہ جو غریب ہیں کہ جنت کی بادشاہت ان کے لیے ہے اور ایک اور موقعہ پر کہا، ایک امیر آدمی کے لیے جنت میں داخل ہونا اتنا مشکل ہے جتنا ایک اونٹ کے لیے سوئی کے ناکے میں سے گزرنا۔ اس لیے تم خوش قسمت ہو کہ تم غریب ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم پر رشک آتا ہے"۔

"وہ تو آپ بجا فرماتے ہیں لیکن یسوع نے یہ بھی تو کہا تھا "تم میں سے کون سا آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اسے پتھر دے یا اگر مچھلی مانگے تو اسے سانپ دے"۔

اب ایک ادھیڑ عمر کے شخص کی باری تھی۔ اس نے عرض کیا "میں متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں، مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ چیزوں کا بھاؤ پوچھتے بھی ڈر لگتا ہے۔ خریدنا تو بڑی بات ہے۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں"۔

"تمہارا مسئلہ تو بالکل معمولی سا ہے" دیسی فرنگی نے مسکرا کر کہا "تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو"۔

"معمولی سا؟ وہ کیسے؟"۔

"ہم سمجھائے دیتے ہیں۔ دیکھئے مہنگائی کے دنوں میں زندہ رہنے کا راز چیزیں خریدنے میں نہیں فروخت کرنے میں ہے"۔

"معاف کیجیے، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔

"مثال ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھئے آپ کا اپنا مکان ہو گا۔ جب آپ نے سے تعمیر کیا تھا تو

زیادہ سے زیادہ پانچ چھ ہزار روپے خرچ ہوئے ہوں گے کیونکہ اس وقت ہر چیز سستی تھی۔اگر آج آپ اسے فروخت کردیں تو پندرہ سولہ ہزار مل سکتے ہیں"۔

''مکان فروخت کردوں تو رہوں کہاں؟''۔

''سسرال جاسکتے ہو''۔

''اور اگر سسرال والے نکال دیں تو پھر مقامی یتیم خانے میں جگہ مل سکتی ہے''۔

''ہاں ہاں۔کیوں نہیں۔آخر یتیم خانہ کس مرض کی دوا ہے''۔

اس کے بعد آنے والے ملاقاتی نے شکایت کی،اسے اتنے ٹیکس دینے پڑتے ہیں کہ اس کے پاس گھر کا خرچ چلانے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔اس نے یہ سوال بھی کیا کہ ٹیکسوں سے جو روپیہ اکٹھا ہوتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔دیسی فرنگی نے اس کا سوال سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔''تم نے وہ مثل نہیں سنی۔گھی کہاں گیا کھچڑی میں''۔

''یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں کہ گھی کھچڑی میں چلا گیا لیکن یہ کھچڑی مجھے بھی تو کھانے کو ملنی چاہیے''۔

''اگر تم نے بوڑھے مالی کی کہانی سنی ہوتی تو یہ کبھی نہ کہتے''۔

''وہ کون سی کہانی ہے؟''۔

''ایک بوڑھا مالی آم کا پیڑ لگا رہا تھا۔بادشاہ سلامت نے اس سے کہا۔جب تک یہ درخت پھل دینے لگے گا،تمہارا انتقال ہو چکا ہوگا۔پر تم یہ پیڑ کیوں لگا رہے ہو''۔مالی نے جواب دیا۔''جہاں پناہ۔میں یہ پیڑ اپنے لیے نہیں آنے والی نسلوں کے لیے لگا رہا ہوں''۔

''لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آنے والی نسلوں کی خاطر موجودہ نسل کا کچومر نکال دیا جائے''۔

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ آنے والے نسلوں کا کچومر نہیں نکالا جائے گا،ان پر ان کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے ٹیکس لگائے جائیں گے''۔

''اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا''۔

''تم ٹھیک سمجھے''۔

''لیکن آخر وہ نسل کون سی ہے جو آم کا پھل کھائے گی''۔

سچ تو یہ ہے ایسی کوئی نسل نہیں۔اس کا وجود فرضی اور خیالی ہے''۔

اس ملاقاتی کے بعد کئی اور ملاقاتی آئے۔ان سب کی تشفی کی گئی۔جس شخص نے شکایت کی

کہ اس کا مسروقہ مال برآمد نہیں کرایا گیا اسے بتایا گیا کہ وہ خوش قسمت ہے کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔ع

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جس طالب علم نے مالی امداد کے لیے درخواست کی، اسے کبیر کا یہ دوہا سنایا گیا۔

کر بہیاں بل اپنی چھانڈ برانی آس
جا کے آنگن ندی ہے سو کسی مرے پیاس

اور جس شخص نے کہا، عدالتوں میں مقدمے چار چار سال لٹکتے رہتے ہیں، اسے یہ خوش خبری سنائی گئی، خدا کے گھر کی طرح عدالتوں میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔

جب دیسی فرنگی سب ملاقاتیوں سے مل چکا تو اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا اور کہا ''ٹوڈی رام! مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کر کے ہمیں بھی مسرت ہوتی ہے۔ لیکن اتنے لوگوں کی اتنے بڑے پیمانے پر مدد کرنے کے بعد ہم تھک سے جاتے ہیں اور اس وقت ہمیں تمہاری مارل سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے''۔

ٹوڈی رام نے بڑے انکسار کے ساتھ جواب دیا ''ملازمت داتا! میں آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہوں''۔

اور یہ کہتے ہی اس نے سکاچ وسکی کا ایک پیگ اپنے باس کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا ''مارل سپورٹ حاضر ہے!''

☆☆☆

بابا کے مزار پر

وقت.........2065 عیسوی

موقع.........بابا کا ایک سو پچاسواں جنم دن

عظیم راہ نما:۔ ملک کو آزاد کرنے والے بابا تم پر لاکھوں سلام! آج کے دن میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں، سنا ہے ایسا کرنے سے روح پاکیزگی سے روشناس ہوتی ہے۔ آپ نے مجھے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب آپ نے میری جانشینی کا اعلان کیا تو

ایک ستم ظریف نے ایک کارٹون میں مجھے دائیں ہاتھ میں گائے کی رسی اور بائیں میں اونٹ کی نکیل تھامے ہوئے دکھایا تھا۔ میں نے ملک کو آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلانے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے میں ناکامیاب رہا۔ شاید اس میں قصور میرا ہی تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ارباب وطن سے شیریں کلامی سے نہیں ڈنڈے سے کام لیا جا سکتا ہے، میں نے انڈے کا بہت کم استعمال کیا۔ بابا! آپ کے پاس تسخیر قلب کا ایک نادر نسخہ تھا۔ یعنی بھوک ہڑتال۔ جب کبھی لوگ راہ راست سے بھٹک جاتے، آپ بھوک ہڑتال کر کے انہیں صحیح راستے پر لے آتے۔ میں اس نسخے کا بھی استعمال نہ کر سکا کیونکہ میں نے اسے اقدام خود کشی کے مترادف سمجھا۔ آپ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے سیکڑوں لوگوں کو تربیت دے کر اس قابل بنا دیا کہ وہ عوام کی راہ نمائی کر سکیں۔ مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج میرے پچانوے کروڑ ہم وطن دن رات یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ میں اللہ کو پیارا ہو گیا تو کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔ بابا، دیکھی آپ نے پچانوے کروڑ انسانوں کی بے بسی۔ آپ ہی انصاف سے کہیے، بے بسی کی اس سے بڑی مثال آپ کو کہاں ملے گی۔

وزیر بے تدبیر:۔ معاف کرنا بابا، میں آپ کے پاس عوام کی شکایت لے کر آیا ہوں۔ آپ کے پاس نہیں آؤں گا تو کس کے پاس جاؤں گا۔ بابا جب میں نے آپ کی ایجاد کردہ وردی پہن کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا تھا، جب حصول آزادی کے لیے میں نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں، جب گوروں کے ہاتھوں لاٹھیاں کھائیں، اس وقت عوام مجھے پسند کرتے تھے اور آج اگر چار پیسے کمانے کی سبیل نکلی ہے تو حسد سے جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔ کمینے کہیں کے! اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر میں نے اپنی گزشتہ خدمات کا معاوضہ وصول کر لیا تو اس میں کون سی قباحت ہے۔ آخر میں اس لیے تو جیل نہیں گیا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد وہی لون تیل کا کاروبار جاری رکھوں، جو سات پشت سے پیشۂ آبا ہے۔ حاسد یہ بھی کہتے ہیں کہ بطور منتظم میں نا اہل ثابت ہوا ہوں۔ آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ چالیس برس تک میں ہلدی، شکر اور دیسی صابن بیچتا رہا۔ اب راتوں رات ایک قابل منتظم کیسے بن جاؤں۔ کچھ لوگ یہ بھی شکایت کرتے ہیں کہ میرا سب سے بڑا پلان ''آنے والے سات سال میں اپنے احباب اور رشتے داروں کو ملازمت دلوانا

ہے''۔ آپ ہی فرمائیے آخرایسا کرنے میں کیا حرج ہے۔ مشہور ضرب المثل ہے: اول خویش بعد درویش۔ بابا آپ دعا کیا کرتے تھے۔ خدا سب کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ خدا جانے عوام کو کب عقل آئے گی۔

عوام:۔ بابا آپ سب کی فریاد سنتے ہیں۔ ہماری بپتا بھی سنئے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب ملک آزاد ہوگا تو ہم خوش حال ہو جائیں گے لیکن یہ کہ ہم بے حال ہو گئے۔ خسارے کے بجٹ بنانے والے ماہرین کہتے ہیں کہ ہم ان پر بھروسا رکھیں، وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا جانے وہ کب آئے گا۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ چنے موتیوں اور امرود سیب کے بھاؤ بک رہے ہیں ٹیکسوں کے بوجھ سے کمر دوہری ہوگئی ہے لیکن ماہرین کے خیال میں ابھی اس پر کچھ اور ٹیکس لادے جاسکتے ہیں۔ جب ہم ان سے پوچھتے ہیں اگر آپ کے پلان کامیاب رہے ہیں تو ہم خوشحال کیوں نہیں ہوتے ،تو جواب ملتا ہے آبادی بڑھ گئی ہے بابا۔ اگر یہی بات ہے تو ماہرین سب پلان چھوڑ کر آبادی گھٹانے کا پلان کیوں نہیں بناتے۔

مشہور سیاسی جماعت:۔ بابا تمہارا انتقال کیا ہوا میں یتیم ہوگئی۔ تمہارے جیتے جی لوگ مجھے سرآنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اب مجھ سے یوں بدکتے ہیں جیسے میری پیشانی پر لکھا ہوا ہو'' چار سو چالیس وولٹ خطرہ'' آزادی ملنے سے پہلے جب میں کسی بڑے شہر میں جاتی تھی تو مجھے دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ اب جاتی ہوں تو ڈر کے مارے لحافوں میں گھس جاتے ہیں۔ بابا کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اب بوڑھی ہوگئی ہوں اور میرے رنگ روپ میں کوئی کشش نہیں رہی۔ آپ کی آنکھیں کیا بند ہوئیں۔ آپ کی امت نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ آپ تو کوئی بری بات نہ دیکھتے نہ سنتے اور نہ کہتے تھے۔ آپ کے بیشتر مریدوں نے قسم کھارکھی ہے کہ کوئی اچھی بات نا سنیں گے نہ دیکھیں گے اور نہ کہیں گے۔

ایک بچہ:۔ بابا آپ بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ آج کے بچے کل کے راہ نما ہیں۔ ذرا جنت سے آکر دیکھئے تو کل کے رہنماؤں کی کیا گت بن رہی ہے۔ ہمارے نصاب میں اتنی کتابیں شامل کی گئی ہیں کہ انہیں اٹھانے کے لیے ایک خچر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ فیس اتنی زیادہ دینا پڑتی ہے کہ سکول میں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے، کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ مہنگائی

کی وجہ سے گھر والوں نے جیب خرچ بند کر دیا ہے۔ استادوں کو تنخواہ کم ملتی ہے۔ اس لیے وہ اپنا غصہ سرکار پر نکالنے کی بجائے ہم پر نکالتے ہیں۔ بابا آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہزاروں بہنیں لاکھوں بچوں کے پھول ایسے چہرے مرجھا گئے ہیں، جسم نحیف و نزار اور نگاہیں گرسنہ اور اداس ہیں۔

بابا:۔ میں نے آپ سب کی پکار سن لی۔ میں سچ کہتا ہوں۔ آج سے اسی (80) برس پہلے جب مجھے شہید کیا گیا۔ مجھے اتنا رنج نہیں ہوا تھا جتنا آپ کی باتیں سن کر ہوا۔ میں اپنے مزار میں لیٹے ہوئے اکثر سوچتا ہوں کیا یہی وہ آزاد ملک ہے جس کا خواب میں نے دیکھا تھا۔ لیکن میں بے بس ہوں۔ میں آپ کو کیا تسلی دے سکتا ہوں۔ میں تو جب اس انتہائی اخلاقی گراوٹ پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اپنے آخری الفاظ دہرا کر رہ جاتا ہوں، یا خدا اس محسن کش قوم کو اب اگر تو بھی چاہے تو نہیں بچاسکتا''۔

☆☆☆

تہمت

ہمارا خیال ہے آپ ہم سے غائبانہ طور پر ضرور متعارف ہوں گے۔ اگر نہیں ہیں تو پھر آپ اس شہر میں نہیں رہتے ہوں گے یا آپ کی واقفیت کا دائرہ ضرورت سے زیادہ محدود ہو گا۔ آخر ہم کوئی معمولی انسان نہیں، ہفتہ وار ''تہمت'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ہم نے ایہ اخبار کیوں نکالا؟ یہ مت پوچھیے، نہایت دردناک داستان ہے۔ بی اے میں چار بار فیل ہونے کے بعد جب ظالم سماج نے ہمیں چپڑاسی تک کی نوکری دینے سے انکار کر دیا تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم نے ہفتہ وار ''تہمت'' کا ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ پچھلے تین سال سے یہ اخبار نکال رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بڑے آرام سے ہیں۔ اب سوچتے ہیں شروع سے یہ دھندا اختیار کیا ہوتا تو اس وقت ایک ڈی لکس امریکن کار کے مالک ہوتے۔ خیر اب بھی گھوڑا گاڑی غنیمت ہے۔ انشاءاللہ کار اگلے سال خرید لی جائے گی

ہمارے اخبات میں صرف تہمتیں چھپتی ہیں۔ تہمت میں یہ خوبی ہے کہ کسی بھی شخص پر لگائی جاسکتی ہے۔ آخر ذات خدا کے علاوہ کون عیوب سے مبرّا ہے؟ بڑے سے بڑے دیش بھگت کو بگلا بھگت ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ صاحب جنہوں نے یتیموں کو پالنے کے لیے یتیم خانہ کھول

رکھا ہے،ان کے بارے میں لکھا جا سکتا ہے کہ موصوف خود تیموں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم آئے دن کس لیے سنسنی خیز انکشافات کرتے رہتے ہیں۔لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم محض سنسنی کے لیے سنسنی پھیلاتے ہیں،تو یقیناً آپ حق بجانب نہیں۔اسی طرح اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد لوگوں کو بے نقاب کرنا ہے،تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ ہم واعظ ہیں نہ ناصح۔ہم تو فقط ایک کاروباری آدمی ہیں اور ہر ایک سمجھ دار بیوپاری کی طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہمارا نصب العین ہے۔

ہم روپیہ کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجئے۔اس بڑے شہر میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں سیکڑوں اشخاص ایسے بھی ہیں جن کے اعصاب پر احساس جرم سوار ہے۔یعنی جنہیں ہر وقت پولیس یا خفیہ پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔یہ لوگ ہمارے ان داتا ہیں،کیونکہ ہم ان کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں۔آپ شاید ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

چند مہینے ہوئے ہم نے جلی حروف میں ایک سرخی چھاپی۔''شہر کے معزز ترین رئیس کی کارستانی،انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جعلی رجسٹر''اس سرخی کے تحت ہم نے اپنے خاص نامہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا (یاد رہے کہ ہم خود ہی اپنے اخبار کے خاص نامہ نگار منیجر اور چیف ایڈیٹر ہیں) ہاں تو ہم نے انکشاف کیا کہ ایک رئیس پچھلے پانچ سال سے محکمہ انکم ٹیکس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے،حالانکہ اس کی آمدنی دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے لیکن اس نے افسروں کو دھوکا دینے کے لیے جعلی رجسٹر بنا رکھے ہیں۔اس سازش میں اس کی بیوی کے علاوہ اس کا بڑا لڑکا بھی شامل ہے۔ممکن ہے اس کی بہو کا بھی ہاتھ ہو،مزید انکشافات کی توقع ہے''۔

جس دن یہ خبر چھپی۔خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک درجن روساء،اخبار''تہمت'' کے دفتر میں (کہ جو دفتر ہونے کے علاوہ ہمارا غسل خانہ بھی ہے) ہم سے ملاقات کرنے کے لیے آئے۔لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے کو معزز ترین سمجھتا تھا۔قریب قریب ہر ایک نے منت سماجت کے لہجے میں درخواست کی کہ ہم اس کا نام اور پتا اخبار میں شائع نہ کریں نہیں تو غضب ہو جائے گا اور اس سے پیشتر کہ ہم اس خدمت کے لیے اس سے معاوضہ طلب کرتے اس نے بڑی شرافت سے ایک معقول رقم نذر کرتے ہوئے کہا کہ میری عزت آپ کے یعنی

اخبار ''تہمت'' کے ہاتھ ہے۔

کوئی دو ہفتے کا ذکر ہے ہماری اس سرخی نے قیامت برپا کر دی۔ ''نوجوان بہو کو قتل کرنے کی خطرناک سازش'' دو کالم کی اس چٹپٹی خبر میں ہم نے ایک فرضی سسر اور ساس کا ذکر کیا جو روپے کے لالچ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بہو کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم نے لکھا ''محض اس لیے کہ وہ بدبخت جہیز میں موٹر کی بجائے سکوٹر لائی تھی۔ حریص ساس اور سسر اس کا قصہ تمام کرنا چاہتے ہیں''۔ قارئین تفاصیل کا انتظار کریں۔

اس خبر کو پڑھ کر ایک سیٹھ صاحب ہانپتے ہانپتے ہمارے دفتر تشریف لائے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ حالانکہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہنے لگے۔ ''ایڈیٹر صاحب خدا کے لیے اس قصے کی تفاصیل چھاپنے سے احتراز کیجئے نہیں تو میری آبرو مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی بہو کو تنگ نہیں کروں گا، اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ جہیز میں موٹر کی بجائے سکوٹر لائی ہے تو میں سکوٹر پر ہی قناعت کر لوں گا''۔

ہم نے کہا۔ ''یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب اخبار ''تہمت'' اپنی زبان کھولتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے آپ ہمارا مطلب سمجھتے نہیں نا...... یعنی......''

''جی ہاں، میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ فی الحال پانچ سو روپے کی حقیر رقم حاضر ہے، اگر یہ کافی نہیں تو کچھ اور......'' ''بس مبلغ پانچ سو اور بھجوا دیجئے۔ معاملہ رفع دفع ہو جائے گا''۔

آپ شاید یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے قارئین نے اس قصے کی مزید تفاصیل پڑھنے پر کیوں اصرار نہیں کیا۔ تو صاحب اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اگلے شمارے میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ قصوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک کا عنوان تھا۔ ''چار سو بیس کی دلچسپ مثال پنسلین کی بجائے پانی کے ٹیکے''۔ اور دوسرے کی سرخی تھی۔ ''افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا استعمال''۔ ظاہر ہے کہ جب قارئین کو بدن کے رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں پڑھنے کو ملیں تو وہ ساس اور بہو کے جھگڑے میں کیوں دلچسپی لیں گے۔ اپنے خاص الخاص نامہ نگار کی وساطت سے

(یعنی اپنی ہی وساطت سے) ہم نے ایک ڈاکٹر کی خباثت کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے لکھا کہ وہ مریضوں کو پنسلین کی بجائے پانی کے ٹیکے لگاتا ہے۔ ہم نے مطالبہ کیا کہ معاملے کی فوری تحقیق کی جائے اور اس بد طینت ڈاکٹر کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ موخر الذکر خبر میں ہم نے ایک یونانی حکیم کی قلعی کھولتے ہوئے بتایا کہ وہ افیم چھڑانے کے لیے افیم کی گولیوں کا جن پر اس نے شکر کا غلاف چڑھا رکھا ہے، استعمال کراتا ہے۔ اب آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ کتنے ڈاکٹر اور حکیم معاملہ طے کرنے کے لیے بھاگم بھاگ ہمارے پاس پہنچے اور کس کس چیز کا واسطہ دے کر انہوں نے درخواست کی کہ ہم ان کے تجارتی رازوں کو فاش کرنے کی مزید کوشش نہ کریں۔ ہم نے انہیں کاروبار جاری رکھنے کی اس شرط پر اجازت دی کہ وہ ''تہمت بھونچال فنڈ'' میں تین تین سو روپے چندہ جمع کرائیں۔ ''تہمت بھونچال فنڈ'' ہماری جدت اور ایجاد ہے۔ یہ فنڈ اس لیے جمع کیا جا رہا ہے جو کبھی آیا ہے نہ آئے گا۔

تو صاحب! یہ ہے ہمارا روپیہ کمانے کا طریقہ۔ آپ کی دعا سے ایسا دماغ پایا ہے کہ ہر روز نئی نئی سرخیاں سوجھتی رہتی ہیں۔ قارئین کو اس قسم کی سنسنی خیز خبریں پڑھنے کا ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ اگر ایک آدھ دن اخبار لیٹ ہو جائے تو کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔ آخر ''تہمت'' کے علاوہ کونسا اخبار ہے جو انہیں اس پائے کی سرخیاں دے سکتا ہے۔ ''ایک کم سن پروفیسر کا معاشقہ'' ''بوڑھے خاوند کی نوجوان بیوی کا پراسرار فرار'' ''خادمہ سے محبت کرنے کا شاخسانہ'' وغیرہ وغیرہ۔

ہم جانتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لے رہا ہے کہ ہمارا ضمیر ہمیں یہ سب چھاپنے کی اجازت کس طرح دیتا ہے۔ تو صاحب اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرحوم ضمیر کو خدا بخشے ہم کو مدتوں سمجھاتا رہا کہ میاں کیوں خوامخواہ اپنی عاقبت خراب کرتے ہو لیکن ہم نے اس بھلے مانس کو صرف ایک مصرع سنا کر خاموش کر دیا یعنی ع اب تو آرام سے گذرتی ہی۔ مادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو لوگ ضمیر کی ضرورت سے زیادہ پروا کرتے ہیں عموماً بزدل ہونے کے علاوہ تنگدست بھی ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم پر بزدلی کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی اور ہم نے دین و دنیا میں سے موخر الذکر کا انتخاب کیا ہے اور صاحب ہمارا تو تجربہ ہے کہ

آدمی ضمیر کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے مرنے کے بعد سنگ لحد پر شعر لکھ دیا جائے گا۔

تہمت چندا اپنے ذمہ دھر چلے　　　جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

اچھا صاحب تو یونہی سہی۔ کم از کم آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ بہت اچھا شعر ہے اور اتنے اچھے شاعر کا ہے۔ ہماری مانئے تو لوگوں کو یہ شعر گنگنانے دیجئے اور خود آرام سے قبر میں لیٹئے۔

☆☆☆

مرزا جگنو

مرزا جگنو کی کمزوری شراب ہے نہ عورت بلکہ پان، آپ پان کچھ اس کثرت سے کھاتے ہیں جیسے جھوٹا آدمی قسمیں یا کام چور نوکر گالیاں۔ اگر پان کھا کر خاموش رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اپنا اپنا شوق ہے۔ کسی کو غم کھانے میں لطف آتا ہے، کسی کو مار کھانے میں اور کسی کو پان کھانے میں لیکن مصیبت یہ ہے کہ مرزا پان کھاتے ہیں نہیں، دن رات اس کے گن گاتے ہیں۔ انہوں نے مشہور ضرب المثل ''جس کا کھائیے اس کا گائیے'' میں یہ ترمیم کی ہے ''جسے کھائیے اس کا گائیے'' جو شخص پان نہیں کھاتا، وہ ان کی نگاہ میں اول درجے کا بدذوق ہے۔ اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ ''پان کھائے بغیر تحریر و تقریر میں رنگینی پیدا کرنے کی کوشش گلال کے بغیر ہولی کھیلنے کے مترادف ہے''۔

مرزا صاحب یوپی سے پنجاب میں آئے ہیں، اس لیے انہیں بنارسی اور لکھنؤی پانوں کی یاد ہر وقت ستاتی رہتی ہے۔ لکھنؤ کے پستئی پانوں کا ذکر کرتے وقت اکثر ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ ''اجی صاحب! کیا بات تھی پستئی پانوں کی۔ واللہ! تلے اور اوپر چار گلوریاں کھائیے، چودہ طبق روشن ہو جائیں اور اب یہاں وہ پان زہر مار کرنا پڑ رہا ہے، جسے پان کی بجائے ڈھاک کا پتہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس پر ستم یہ کہ یہاں قریب قریب ہر شخص تنبولی سے خرید کر کھاتا ہے۔ غضب خدا کا، بڑے سے بڑے رئیس کے ہاں چلے جائیے، میز پر مٹھائیوں اور لسی کے بڑے بڑے گلاسوں کا انبار لگا دے گا لیکن پان کی فرمائش کیجیے تو بغلیں جھانکنے لگے گا یا خفت مٹنے کے لیے نوکر سے کہے گا۔ ''ارے بھئی چوکھے لال! مرزا صاحب کے لیے پان

خریدنا تو یاد ہی نہیں رہا۔ ذرا لپک کر ماتا دین پنواڑی سے ایک پان تو لے آؤ'' اور پھر یک لخت معصوم سا بن کر آپ سے ایک ایسا سوال کرے گا جسے سن کر آپ کا جی سر پیٹنے کو چاہے گا۔ ''کیوں صاحب میٹھا کھائیں گے یا الائچی سپاری والا؟'' لاحول ولا قوۃ! پانوں کی بڑی بڑی قسمیں سننے میں آئیں لیکن یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ میٹھا پان کیا بلا ہوتی ہے۔ بارہ مسالے کو ایک فضول سے سبز پتے میں کچھ اس طرح لپیٹ دیتے ہیں کہ اس پر جوشاندے کی پڑیا کا گمان ہوتا ہے۔ اسے یہ حضرات میٹھا پان کہتے ہیں۔ صاحب حد ہوگئی ستم ظریفی کی۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ پان کی بجائے آدمی دو تولے گڑ یا شکر پھانک لیا کرے''۔

مرزا جگنو پان کے اس قدر عاشق ہیں کہ جس وقت دیکھو پان کھا رہے ہوں گے یا پان کی شان میں قصیدہ تصنیف کر رہے ہوں گے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ زبان کے علاوہ جو چیز ہمیشہ ان کے بتیس دانتوں میں رہتی ہے، وہ پان یا ذکر پان ہی ہے۔ یہ کھانے کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ چائے نہ ملے تو کوئی بات نہیں لیکن پان کے بغیر ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''مرزا صاحب! پان کھا کھا کر آپ نے دانتوں کا ستیاناس کر لیا ہے۔ آپ کے منہ میں اب دانت نہیں گویا گلے سڑے انار کے دانے ہیں۔ خدا کے لیے اب تو پان کھانا چھوڑ دیجیے''۔ مرزا صاحب نے پیک کی پچکاری ہماری سفید پتلون پر چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیا کہا، پان کھانا چھوڑ دوں؟ یہ کیوں نہیں کہتے خودکشی کر لوں۔ اجی حضرت ع پان ہے تو جان ہے پیارے۔ آپ کے سر عزیز کی قسم ہم تو جنت میں بھی قیام کرنے سے انکار کر دیں گے، اگر وہاں پان سے محروم رہنا پڑا۔ آپ کو معلوم ہے کہ والد ماجد ہمیں ولایت بھیجنے پر مصر تھے۔ فرماتے تھے دو ایک سال آکسفورڈ گزار آؤ، زندگی بن جائے گی۔ لیکن ہم نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ انگلستان میں پان کہاں ہیں''۔

''وہ تو شاید آپ نے اچھا کیا جو ولایت نہیں گئے نہیں تو فرنگیوں کی پتلونوں کی خیر نہیں تھی''۔ ہم نے مرزا کو بناتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ جو آپ نے ہماری مکھن زین کی قیمتی پتلون کو تباہ کر دیا، یہ ہمیں کس گناہ کی سزا دی''۔

مرزا صاحب نے اپنا پیک سے بھرا ہوا منہ اوپر اٹھا کر اور ضرورتاً دیوار پر پیک سے گلکاری

کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اجی حضرت! یہ سب آپ کا قصور ہے۔ یہ دیوان خانے میں اگالدان نہ رکھنے کی سزا ہے، جو آپ کو دی گئی ہے۔ بندۂ خدا! الم غلم سے سارا کمرا بھر رکھا ہے لیکن اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک اگالدان ہی خرید لیں۔ اپنے لیے نہیں تو مہمانوں کے لیے۔ گلے میں جب ایک نہ دو اکٹھی چار گلوریاں ہوں اور مشکی دانے کا تمبا کو ضرورت سے زیادہ تیز ہو اور سامنے اگالدان موجود نہ ہو تو خود ہی بتایئے، بجلی کی طرح پیک آپ کی پتلون پر نہیں گرے گی؟''

ہمیں مرزا جگنو کے گھر جب کبھی جانے کا موقع ملا، ہمیشہ انہی قسم کے مشاغل میں مصروف پایا، کبھی چھالیا کتر رہے ہیں۔ کتھے کو کیوڑے کی خوشبو میں بسا رہے ہیں یا چونا چکھ چکھ کر دیکھ رہے ہیں کہ مطلوبہ تندی کا ہوا ہے یا نہیں اور کبھی مرادآبادی تمباکو کی بلائیں لے رہے ہیں۔ کئی باران سے عرض کیا۔ ''آپ اتنے عالم، فاضل ہیں۔ غزل کہنے میں استاد تسلیم کیے جاتے ہیں، مشاعروں کو لوٹ لینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ زہد اور پارسائی کی محلے بھر میں دھوم ہے۔ پھر آپ پان کھانے کی عادت ترک کیوں نہیں کر سکتے۔ جب کہ آپ جانتے ہیں کہ پان دانتوں اور مسوڑھوں کا زیاں ہے''۔

ہر بار مرزا بگڑ کر فرماتے ہیں۔ ''حضرت! ہر بڑے شخص میں ایک آدھ کمزوری ضرور ہوتی ہے، یہ بات نہ ہو تو اس کا شمار فرشتوں میں بھی ہونے لگے۔ غالب کو ہی لیجئے، اتنے عظیم شاعر لیکن بادہ نوشی کی ایسی لت پڑی کہ ادھار لینے میں بھی انہیں عار نہیں تھی۔ وہ تو دعا بھی اس لیے مانگتے تھے کہ انہیں شراب ملے۔ تم نے وہ لطیفہ سنا ہوگا ایک دفعہ جب انہیں شراب دستیاب نہ ہوئی تو وضو کر کے نماز پڑھنے کی ٹھانی۔ ابھی وضو ہی کر پائے تھے کہ ان کا ایک شاگرد کہیں سے شراب کی بوتل لے آیا۔ فوراً نماز پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور شراب پینے لگے۔ شاگرد نے پوچھا ''نماز نہیں پڑھیے گا کیا؟'' ہنس کر فرمایا۔ ''جس چیز کے لیے دست بدعا ہونا تھا وہ مل گئی، اب نماز پڑھنے کا فائدہ؟''

''لیکن مرزا صاحب! شراب کی بات اور ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ لیکن پان میں تو ایسی کوئی بات نہیں'' ہم نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''اجی حضرت!'' مرزا صاحب نے فرمایا۔ ''پان کھانے کا لطف پان خور ہی جانتا ہے۔ آپ پاکباز قسم کے لوگ کیا جانیں۔ اس کی نضیلت کا حال تو بیربل سے پوچھئے جس نے اکبر

کے سوال کرنے پر کہ سب سے بڑا پتا کون سا ہے، عرض کیا تھا۔ ''مہابلی! پان کا پتہ، جسے اس وقت ظل الٰہی کھا رہے ہیں''۔ لیجئے اب تو سند بھی مل گئی کہ پان وہ چیز ہے جسے خود مغل اعظم نے منہ لگایا۔ اب آئندہ ہمارے پان کھانے پر اعتراض نہ کیا کیجئے''۔

''مگر پھر بھی ہمارا خیال ہے اگر آپ پان خور نہ ہوتے تو ولی ہوتے''۔

''سبحان اللہ کیا پتے کی بات کہی ہے آپ نے۔ یعنی صرف اتنی سی بات کے لیے کہ ہم ولی کہلوائیں، پان خوری چھوڑیں۔ نا صاحب! ہمیں یہ خسارے کا سودا بالکل پسند نہیں۔ ہمارا تو عقیدہ ہے۔

تم مرا دل مانگ لو دل کی تمنا مانگ لو
پان دے کر مجھ کو تم چاہو تو دنیا مانگ لو

اور ہاں دیکھئے صاحب! اب بحث بند کیجئے۔ ایک گلوری اپنے اور ایک ہمارے منہ میں ڈالئے اور کسی لکھنؤی شاعر کا ایک بے نظیر شعر سنئے اور سر دھنئے کہ پان کے ذکر نے شعر کو کتنا رنگین بنا دیا ہے ہاں تو وہ شعر ہے

پان لگ لگ کے میری جان کدھر جاتے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کدھر جاتے ہیں

ہم نے مرزا صاحب کے اصرار پر گلوری منہ میں ڈالی، شعر بھی سنا اور سننے کے بعد زیر لب گنگنانے لگے۔ ع

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ پان خور ہوتا

☆☆☆

گوہر مخزن ظرافت

شوکت تھانوی مرحوم جب تک بقید حیات رہے، عوام ان سے خوش اور نقاد نالاں رہے۔ موخر الذکر کو مرحوم سے اس طرح طرح کی شکائتیں تھیں۔ مثلاً شوکت تھانوی، شوکت تھانوی کیوں تھے؟ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی یا فرحت اللہ بیگ کیوں نہیں تھے؟ شوکت تھانوی، عوام میں ہردلعزیز کیوں تھے؟ شوکت مزاح نگار ہونے کے علاوہ فلسفی کیوں

نہیں تھے؟ شوکت بسیار نولیس کیوں تھے؟ شوکت ایم اے علیگ یا پی اے کینٹ کیوں نہیں تھے؟ بلاشبہ یہ سب خامیاں شوکت میں تھیں ۔لیکن اگر خدا لگتی کہی جائے تو وہ ان میں سے کسی خامی کے لیے مطلقاً ذمہ دار نہیں تھے۔ اگر وہ شوکت تھانوی کے علاوہ کچھ نہیں تھے تو یہ امران کی خود اعتمادی اور دیانت داری پر دلالت کرتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ کسی مزاح نگار سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اپنے کو دوسروں میں مدغم کردے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب قریب سب نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوکت عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ وہ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا دیدہ دانستہ اس سے آنکھیں چرانا چاہتے ہیں کہ شوکت خواص میں بھی اتنے ہی ہر دلعزیز تھے۔ کیونکہ روساء، علماء اور ادباء بھی ان کے اتنے ہی مداح تھے جتنے کہ عوام۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی ہر دل عزیزی کا خمیازہ ان کے مداحوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی شوکت کی تازہ تصنیف خریدتے، ان کا کوئی نہ کوئی دوست اسے اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ شوکت کی تصانیف دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ میری میز پر مشہور ادباء کی تازہ ترین تصانیف پڑی ہیں، ان میں سے دو ایک کا مصنف شوکت بھی ہے۔ میرے احباب جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں، کسی اور کتاب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے لیکن شوکت کی تازہ تخلیق پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بھوکا آدمی خوانِ نعمت پر۔ اور ان کی اس حرکت کو دیکھ کر مجھے ان پر غصہ اور شوکت پر پیار آنے لگتا ہے اور اسی وقت فوراً مجھے ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

یہ شاید 1945ء کی بات ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور میں، کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ایک مشہور ناشر جو اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ مولوی اور پہلوان کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ہماری میز کے قریب آیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے ہم تینوں سے درخواست کی ''ہمیں بھی کبھی خدمت کا موقع دیجیے''۔

منٹو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا ''بس آپ شوکت تھانوی کی کتابیں ہی چھاپا کیجیے''۔

کرشن اور میں نے منٹو کی ہاں ملاتے ہوئے کہا ''منٹو صاحب ٹھیک فرما رہے ہیں''۔ ایک لحظہ کے لیے ناشر دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ہم تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''گستاخی معاف، ایک بات عرض کر سکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں بڑی شوق سے''۔

''آپ اپنے کو عظیم ادیب سمجھتے ہیں اور شاید عوام کے علمبردار بھی۔ لیکن معاف کیجئے گا، آپ کی تصنیفات عوام نہیں خریدتے، کالج کے چھوکرے اور چھوکریاں خریدتی ہیں، لیکن وہ تو عوام میں سے نہیں ہیں۔ ادھر شوکت تھانوی کی تخلیقات کا یہ حال ہے کہ ہم صرف اس کی نئی کتاب کے نام کا اعلان کرتے ہیں کہ پانچ ہزار جلدیں بک (Book) ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ آپ کی کسی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتا۔ شوکت تھانوی کچھ بھی ہوں، عوام کے لیے لکھتے ہیں...... اچھا اسلام علیکم''۔

وہ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا اور ہم تینوں پر گویا برف گر گئی۔ دل ہی دل میں ہمیں شدید خفت کا احساس ہوا کیونکہ اس کی بات صداقت پر مبنی تھی۔ شوکت کو عوام سے اور عوام کو شوکت سے والہانہ عشق تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی ادیب تھے اور ہم اور ہم جو بزعم خویش اپنے کو عوام کا حمایتی سمجھتے تھے، ان سے اتنے ہی دور تھے جتنا کفر ایمان سے ہوتا ہے۔

شوکت کی یہی خوبی کچھ نقادوں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی ہے۔ میری رائے میں عوام کے لیے لکھنا جرم ہے نہ گناہ۔ آج تمام اشتراکی ممالک میں عوام کے لیے لکھنا باعث فکر خیال کیا جاتا ہے۔ استالین (STALIN) نے ایک بار ادباء سے خطاب کرتے وقت ایک یونانی دیو کی مثال دی تھی جسے کوئی شخص اس وقت تک پچھاڑ نہیں سکتا تھا جب تک اس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے۔ آخر ایک پہلوان نے اسے ہوا میں اچھالا اور اس پر کاری وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ استالین نے اس کہانی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا تھا۔ یاد رکھئے۔ وہ ادیب کبھی فنا نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہیں گے۔ شوکت تھانوی خدانخواستہ اشتراکی ادیب تو نہیں تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ زمین سے اپنا رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہے کہ نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود زندہ رہے اور اپنی زندگی میں زندہ جاوید بھی ہو گئے۔

کچھ نقادوں کو شکوہ تھا کہ شوکت کی ذہنیت خام تھی، ان کا شعور ناپختہ تھا، وہ دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ جو شخص اتنا کچھ لکھے چاہے، وہ ٹیگور ہو، منشی پریم چند یا اقبال ہو، ہمیشہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق نہیں کر

سکتا۔ ٹیگور کو ہی لے لیجئے۔ آپ کو اس کے کلیات میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جنہیں پڑھ کر، آپ کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ خود ٹیگور نے اپنی مشہور عالم تصنیف ''گیتا نجلی'' کے بارے میں کہ جس پر اسے نوبل پرائز ملا لکھا ہے ''میں یہ نظمیں رات کے وقت چھپ کر لکھا کرتا تھا کیونکہ ان میں ادبیت کا فقدان تھا۔ انہیں لکھتے وقت مجھے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی نے آ کے دیکھ لیا تو''۔

اس میں مطلقاً شک نہیں کہ شوکت نے دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں بھی لکھی ہیں۔ بعض اوقات بھلے چنگے مضامین میں فرسودہ یا عامیانہ اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے اعلیٰ قسم کے ادب کی بھی تخلیق کی ہے۔ میرے اس دعویٰ کے ثبوت میں ''مضامین شوکت'' ''شیس محل'' ''پہلی بار پڑھی تو میری ملاقات ایک نئے شوکت سے ہوئی۔ ایسا شوکت جو محض ایک فقرے کے شیشے میں پری اتار سکتا تھا اور جس کے اسلوب بیان کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک جملہ دوسروں کے پورے مضامین پر بھاری تھا۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی بہتوں نے کوشش کی ہے۔ کہیں یا تو انہیں کوزہ میسر نہیں آیا یا وہ ''ذرا سی آبجو'' کو بحر بیکراں کے ساتھ خلط ملط کرتے رہے۔ اس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت صرف شوکت کے حصے میں آئی اور ان کے قلم سے اتنے خوبصورت پھول جھڑے جن کی تازگی اور رعنائی ابدالاباد تک قائم رہے گی۔ ''بار خاطر'' شوکت کا شاہکار ہے۔ میرا تو خیال ہے اگر وہ اس کو لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے تو بھی محض اس تصنیف کی بدولت ان کا نام زندہ رہتا۔ ''بار خاطر'' سے زیادہ کامیاب تحریف ابھی تک نہیں لکھی گئی اور نہ مستقبل قریب میں اس کے لکھے جانے کا امکان ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شوکت کے طنز و مزاح میں شائستگی یا گہرائی نہیں، انہیں چاہئے ''بار خاطر'' کا بار بار مطالعہ کریں۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کبھی کبھی ایک اچھا مضمون مصنف کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتا ہے۔ اسی قسم کا سانحہ شوکت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ انہوں نے ایک مضمون بعنوان سودیشی ریل، لکھا اور سودیشی ریل والے شوکت کے لقب سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ اس مضمون کے بعد انہوں نے سیکڑوں کامیاب مضامین لکھے جنہیں بیشتر نقادوں نے اس بنا پر پڑھنے سے انکار کر دیا کہ سودیشی ریل سے بھلا بہتر مضمون اب شوکت صاحب کیا لکھیں گے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ سودیشی ریل، ان کی ابتدا تھی، نہ کہ انتہا۔ میں ایسے نقادوں کو بھی جانتا

ہوں، جنھوں نے سودیشی ریل، بھی نہیں پڑھا۔ لیکن جو اس امر کے باوجود یہ فتویٰ صادر کرنے کو تیار ہیں کہ شوکت کا مزاح سطحی ہے۔ تنقیدی سطحی پن کی اس سے بدتر مثال مشکل سے ملے گی۔

اور پھر وہ نقاد ہیں جو تنہائی میں شوکت کے مضامین مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن کھلے بندوں اس کی مذمت کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا فیشن میں داخل ہے۔ ان لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

شوکت صاحب تعریف و تنقیص سے بے نیاز تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی نقاد کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ وہ جانتے تھے کہ سب سے بڑا نقاد ''وقت'' ہے اور اگر وہ ان کے مضامین پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں انہیں فراموش کر سکیں گی۔ انہیں نہ کرم کی خواہش تھی نہ ستم کا شکوہ۔ فطرتاً وہ ظریف اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور انہیں خیال، واقعہ یا کردار سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں قابل رشک مہارت حاصل تھی۔ چونکہ انہوں نے کسی مغربی تہذیب کا تتبع نہیں کیا، اس لیے ان کی ظرافت کے تیور سو فیصد مشرقی تھے۔ ان کے تمسخر کا طرہ امتیاز دل جوئی تھا دل شکنی نہیں۔ وہ نہ کسی ''ازم'' (ISM) سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انہوں نے کبھی اپنے طنز و مزاح کو اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ہنسانا تھا۔ وہ مجسم ''اودھ پنچ'' تھے اور شاید اسی لیے ''اودھ پنچ'' کی شان میں کہا گیا اکبرالہٰ آبادی کا قصیدہ مدحیہ شوکت کا بہترین مرثیہ ہے۔

اے گوہر مخزن ظرافت — دے جوہر معدن لطافت
سرمایہ انبساط خاطر — تسکین دل و نشاط خاطر
دیباچہ دفتر فصاحت — عنوان صحیفہ بلاغت
رنگینی میں غیرت گلستان — شوخی میں حریف برق تاباں
معقول مزاح ہے تو یہ ہے — شرعاً مباح ہے تو یہ ہے
ہے خلق خدا قتیل اس کی — حاسد کا حسد دلیل اس کی
ہر کس کہ بدید گفت خوب است — باللہ مفرح القلوب است

☆☆☆

شاطر صاحب

اگر کوئی شخص آپ کو اس مشاعرے کے اختتام پر ملے، جس کے آپ سٹیج سیکرٹری تھے اور آپ کو داد دینے کی بجائے یہ شکوہ زبان پر لائے کہ آپ نے نہایت بے ہودہ شعراء کو پڑھوایا اور خوامخواہ سامعین کا وقت ضائع کیا، تو یقیناً آپ حیران ہوں گے۔ خاص کر، جب آپ کی اس شخص سے راہ و رسم تک نہ ہو۔ بعینہٖ اسی صورت حال سے مجھے دو چار ہونا پڑا۔ جب اس اجنبی سے میری ملاقات ہوئی جو ایک کی بجائے تین تخلص کرتا تھا اور جناب بھڑک دہلوی کا شاگرد تھا۔ میں نے اس سے یہ کہہ کر جان چھڑانا چاہی کہ شعراء کو مدعو کرنے والے اور حضرات تھے، خاکسار نے تو صرف سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ لیکن وہ مجھے معاف کرنے پر آمادہ نظر نہ آیا کہنے لگا۔ ''اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو آپ کو ان جہلا کی تعریف کرنے کا حق کیا تھا۔ غضب خدا کا آپ انہیں شاعر کہتے ہیں، میں تو تک بند تسلیم کرنے کو تیار نہیں''۔

''آپ کی تعریف؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

مجھے شاطر جنڈیالوی کہتے ہیں۔ شاطر کے علاوہ آپ مجھے برباد یا عذاب جنڈیالوی بھی کہہ سکتے ہیں''۔

''تو گویا آپ کے تین تخلص ہیں''۔

''جی ہاں۔ اور یہ اس لیے کہ بندہ بیک وقت رومانی، مزاحیہ اور ترقی پسند شاعر ہے''۔

''آپ کا شغل؟''

''خاکسار ایک مقامی اسکول میں کلرک ہے''۔

''بہت مسرت ہوئی آپ سے مل کر''۔

''اجی صاحب۔ رسمی باتیں رہنے دیجئے۔ دراصل میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آئندہ جب کبھی مشاعرے کا اہتمام کریں، خاکسار کو فراموش نہ کریں، خاص کر جب وہ جناب بھڑک دہلوی کا شاگرد ہے۔

چند دنوں کے بعد شاطر صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ بھڑک دہلوی اور اپنے علاوہ کسی کو شاعر نہیں مانتے اور بھڑک صاحب کو

بھی اس لیے کہ وہ ان کے استاد تھے۔ اتفاق سے میری میز پر ایک مشہور اردو رسالے کا سالنامہ پڑا تھا۔ شاطر صاحب اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ادھر ادھر سے دیکھنے کے بعد انہوں نے بڑی حقارت سے سال نامے کو زمین پر پٹختے ہوئے کہا ''تف یہ خرافات ہے یا شاعری ایک بھی کام کی غزل نہیں۔ بخدا ان سے بہتر غزلیں تو بندہ اچکن کے بٹن بند کرتے وقت کہہ لیتا ہے۔ خدا جانے اس عہد میں شاعروں کو کیا ہوا''۔

میں نے سوال کیا ''آپ کون سے رسالے کو اپنا کلام بھجواتے ہیں؟''

منہ بنا کر کہنے لگے۔ ''کسی رسالے کو بھجوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب سخن شناس ہی اٹھ گئے تو بھینس کے آگے بین بجانے سے فائدہ؟ شروع شروع میں ایک رسالے کی سرپرستی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ غزل بھجوائی۔ ایڈیٹر صاحب نے اس معذرت کے ساتھ واپس کر دی کہ آپ کا کلام کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ سبحان اللہ! یہ پڑھے لکھوں کی سخن فہمی کا عالم۔ یوں نہیں کہتے کہ بالکل گنوار ہیں۔ اس لیے ہمیں معذور سمجھا جائے''۔

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ اچھا کوئی نیا شعر سنائیے''۔

''کیسا شعر سنیں گے آپ، رومانی، مزاحیہ یا ترقی پسند؟''۔

''مزاحیہ''۔

''بہتر تو سماعت فرمائیے۔ عرض کیا ہے''۔

شاطر تمہارے عشق نے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

شعر سن کر مجھ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ شاطر صاحب کو یہ ناگوار گزرا۔ فرمانے لگے ''آپ نے داد نہیں دی''۔

میں نے عرض کیا ''معاف کیجئے شاطر صاحب۔ یہ شعر تو علامہ اقبال کا ہے''۔

شاطر صاحب نے بالکل نہ گھبراتے ہوئے جواب دیا ''آپ پہلے شخص نہیں ہیں جنہوں نے یہ اعتراض کیا ہے۔ دراصل آپ کو اس شعر کا پس منظر معلوم نہیں۔ یہ شعر میں نے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔ وہاں اتفاق سے علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ انہیں اتنا پسند آیا کہ

آبدیدہ ہوکر فرمانے لگے۔ ''کاش آپ میرا سارا دیوان لے لیں اور یہ شعر مجھے دے دیں'' میں نے عرض کیا'' آپ کا دیوان آپ کو مبارک۔ آپ بخوبی یہ شعر لے سکتے ہیں، لیکن اس پر کاپی رائٹ میرا رہے گا''۔

''واقعی آپ نے بڑی فراخدلی دکھائی۔ شاطر صاحب''۔

''جی ہاں۔ اصل میں جو شخص فراخ دل نہیں وہ کبھی بڑا شاعر نہیں ہوسکتا۔ ہاں اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہوگیا۔ اسی مشاعرے میں علامہ آرزو بھی شرکت فرما رہے تھے۔ انہوں نے درخواست کی'' چونکہ اس شعر کے دوسرے مصرع (مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی) میں میرا تخلص اتفاق سے آ گیا ہے، اس لیے یہ مصرع مجھے عنایت کریں۔ لیکن میں نے ان سے معذرت چاہتے ہوئے کہا'' جب میں سارا شعر اقبال کو دے چکا ہوں تو اس کا ایک مصرع آپ کو کیسے دے سکتا ہوں''۔

''بہت خوب۔ اچھا کوئی اور شعر سنایئے''۔

''ایک رومانی شعر سنئے''۔

''ارشاد''۔

نے شاطر کو نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

''دوبارہ معاف کیجئے شاطر صاحب۔ لیکن یہ شعر تو......''۔

''آپ کا مطلب ہے غالب کا ہے''۔

''جی ہاں''۔

''آپ کو پھر مغالطہ ہوا۔ لیکن اس میں آپ کا قصور نہیں۔ اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ جس مشاعرے میں پڑھا گیا، وہاں صاحب صدر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا'' ایسا شعر تو غالب ہی کہہ سکتا ہے''۔ اتفاق سے سامعین میں ایک کاتب بھی موجود تھا جو انہیں دنوں'' دیوان غالب'' کی کتابت کر رہا تھا۔ اس نے از راہ عقیدت یہ شعر بھی غالب سے منسوب کر دیا ورنہ اہل دل جانتے ہیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے غالب نے آموں کے علاوہ کسی چیز سے عشق نہیں کیا اور کوئی شخص لذیذ آم کھا کر نکما نہیں ہوسکتا''۔

ایک دن یونہی بازار میں شاطر صاحب کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''میں آپ ہی کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ ایک ضروری مشورہ کرنا ہے''۔

''فرمائیے''۔

''لکھنؤ میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ منتظمین نے دعوت نامہ بھجوایا ہے۔ آپ کے خیال میں مجھے وہاں جانا چاہئے یا نہیں''۔

''ضرور جائیے۔ بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''۔

''لیکن معاوضہ بہت قلیل ہے۔ صرف پانچ سو روپے اور فرسٹ کلاس کا کرایہ''۔

''یہ قلیل تو نہیں''۔

''کیا کہا۔ قلیل نہیں'' شاطر صاحب نے گرج کر کہا۔ ''بھڑک دہلوی کے اکلوتے شاگرد کے لیے صرف پانچ سو روپے۔ یہ میری ہی نہیں بھڑک صاحب کی بھی توہین ہے''۔

''تو مت جائیے''۔

''لیکن آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے، سوچتا ہوں چلا ہی جاؤں''۔

''تو چلے جائیے''۔

''آپ کا مطلب ہے اس توہین کے ساتھ سمجھوتا کر لوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بھڑک صاحب نے وصیت کی تھی کہ صاحب زادے ذلیل سے ذلیل حرکت کا ارتکاب کرنا لیکن قلیل معاوضہ قبول نہ کرنا''۔

''پھر تو آپ کو ہرگز نہیں جانا چاہیے''۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں انہیں آج ہی تار بھجوا دیتا ہوں کہ مجھے معذور سمجھا جائے''۔

شاطر صاحب کا اس مشاعرے میں شرکت نہ کرنے کا بڑا شہرہ ہوا۔ سارے شہر میں ان کی دھوم مچ گئی۔ ہر شخص نے ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی نازک مزاج شاعر موجود ہیں۔ ایک رئیس کو جب پتا چلا تو اس نے شاطر صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے لڑکے کا (جس کی شادی مستقبل قریب میں ہو رہی تھی) سہرا لکھیں۔ کافی بحث تکرار کے بعد شاطر صاحب نے ان کی فرمائش منظور کر لی۔ ساڑھے سات سو روپیہ معاوضہ قرار پایا۔

دلدادگان شعروسخن بڑے اشتیاق سے شاطر صاحب کے سہرے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا، جب شاطر صاحب کو سہرا پڑھنا تھا۔ وہ ایک نئی شیروانی میں ملبوس ہوکر سٹیج پر تشریف لائے۔ سامعین کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ دو ایک بار کھانسے اور رئیس صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ حضور عرض کرتا ہوں۔

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

جب کہ اپنے میں سما دیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

شاطر صاحب نے ابھی دو شعر ہی پڑھے تھے کہ سامعین میں سے کسی نوجوان نے پکار کر کہا ''اجی صاحب یہ کیا مذاق ہے۔ غالب کا سہرا آپ اپنے نام سے پڑھ رہے ہیں''۔

شاطر صاحب نے چلا کر جواب دیا ''کون کہتا ہے یہ سہرا غالب کا ہے''۔

''میں کہتا ہوں'' اس نوجوان نے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

''ثبوت؟'' شاطر صاحب نے مطالبہ کیا۔

''یہ رہا ثبوت'' نوجوان نے جیب میں سے ''دیوان غالب'' کا پاکٹ ایڈیشن نکالتے ہوئے کہا۔ جلسے میں ہلچل مچ گئی۔ شاطر صاحب یہ کہتے ہوئے ''معاف کیجیے۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا'' جلسے سے نوک دم بھاگے۔ دوسرے دن ہم نے سنا کہ شاطر صاحب نے شہر چھوڑ کر جنڈیالے میں سکونت اختیار کر لی ہے۔

☆☆☆

مرزا نکتہ

جو اصحاب مرزا نکتہ کو جانتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ''نکتہ'' ان کا نام یا تخلص ہے حالانکہ یہ ان کا لقب ہو جو کسی ستم ظریف نے ان کی نکتہ شناسی کی داد دیتے ہوئے انہیں عطا کیا تھا۔ مرزا نکتہ میں یہ وصف ہے کہ وہ بات بات میں نکتہ پیدا کرتے ہیں۔ اب چونکہ ہر بات میں نکتہ پیدا کرنا آسان نہیں اس لیے اکثر وہ ایسی عجیب وغریب باتیں کرتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی دوسرا کہے تو لوگ اسے یقیناً پاگل یا خبطی سمجھیں لیکن مرزا کے سن وسال کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں محض مرزا نکتہ کہتے ہیں۔

مرزا سے میری پہلی ملاقات ایک مجلس میں ہوئی۔ وہاں آپ سامعین کو یہ نکتہ ذہن نشین

کرانے کی کوشش کررہے تھے کہ صبح سویرے اٹھنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ دلیل انہوں نے یہ پیش کی کہ طبی نقطہ نگاہ سے دس گھنٹے سونا نہایت ضروری ہے۔ نیز صبح کے وقت جو ٹھنڈی ہوا چلتی ہے، وہ ایک قسم کی لوری ہے جو قدرت اپنے بچوں کو سلانے کے لیے گاتی ہے۔ سامعین میں سے کسی نے کہا ''دیر سے اٹھیں تو سارا دن طبیعت پر سستی کا غلبہ رہتا ہے''۔ مرزا نے چہک کر فرمایا: ''اس کی وجہ افیون کھانے کی عادت ہے، دیر سے اٹھنا نہیں''۔ اتنے میں کسی اور شخص نے سوال کیا ''مرزا صاحب ہزاروں لوگ صبح سویرے اٹھ کر سیر کو جاتے ہیں، ان کے متعلق کیا خیال ہے؟'' مرزا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ ''عموماً یہ لوگ بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں''۔

مرزا کی حاضر جوابی سے میں بہت متاثر ہوا۔ واقعی ان کا طرز استدلال نرالا تھا۔ میں نے ان سے راہ ورسم پیدا کرنے کا فیصلہ کیا، میری توقع کے خلاف بہت جلد مرزا میرے بے تکلف دوست بن گئے اور تب مجھ پر یہ راز کھلا کہ ان سے دوستی کر کے میں نے بہت بڑی مصیبت مول لی ہے۔ اختلاف مرزا کی گھٹی میں پڑا ہے۔ ادھر میں نے کوئی بات کی، ادھر جھٹ مرزا نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا ''آپ کا خیال سو فیصد غلط ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بہت سے پڑھے لکھوں کی طرح آپ بھی بالکل جاہل ہیں''۔

ایک دن میں نے برسبیل تذکرہ کہا ''موسم گرما میں روزانہ غسل کرنا چاہئے۔ مرزا پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے ''روزانہ غسل کا کیا فائدہ ہے؟ کیا آپ کا جسم صرف چوبیس گھنٹوں میں اتنا غلیظ ہو جاتا ہے کہ آپ کو روزانہ نہانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ شاید نہیں جانتے غسل کرنا نہایت غیر قدرتی فعل ہے۔ آپ نے کبھی جانوروں پرندوں یا کیڑے مکوڑوں کو نہاتے دیکھا ہے؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ''چڑیوں اور بھینسوں کو نہاتے تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا''۔

فرمانے لگے۔ ''یہ سب حضرت انسان کی صحبت کا اثر ہے۔ میرا دعویٰ ہے اگر انسان نہانا ترک کر دے تو چڑیوں اور بھینسوں کو بھی اس فضول وہم سے نجات مل جائے''۔

''توبہ توبہ! مرزا صاحب، آپ نہانے کا شمار فضول توہمات میں کرتے ہیں''۔

''بے شک'' مرزا نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا ''نہانا مہذب انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے''۔

''میری دانست میں اگر وہ نہانے سے توبہ کرے تو وقت کے علاوہ صابن اور تیل کی بھی بچت ہوسکتی ہے''۔ ویسے تو مرزا ہر بات میں اختلاف رائے کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ لیکن جب بحث موسم سے متعلق ہوتو اس وقت ان کی گفتگو سننے کے قابل ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے مرزا کو ہر ایک موسم سے خداواسطے کا بیر ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے موسم بہار کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ موسم قدرت کا بہترین عطیہ ہے''۔ مرزا صاحب نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''میاں! عقل کے ناخن لو بھلا یہ بھی کوئی موسم ہے، جب شاعر اپنا گریباں پھاڑ کر صحرا کا رخ کرتا ہے یا سرد آہ کھینچ کر کہتا ہے اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے''۔

تم نے وہ میر کا شعر نہیں سنا:

دھوم ہے پھر بہار آنے کی
کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی

اور یاد ہے مومن نے بہار کے متعلق کیا کہا تھا، انہوں نے فرمایا تھا۔

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید مرزا کو برسات کا موسم پسند ہوگا۔ میں نے اس کا تذکرہ کیا۔ مرزا نے پہلے سے بھی زیادہ برافراختہ ہو کر کہا ''برسات سے زیادہ واہیات موسم شاید ہی کوئی ہو گا۔ سیلاب آتے ہیں تو اس موسم میں، ہیضہ پھیلتا ہے تو اس موسم میں، اور گھر ٹپکتا ہے تو اس موسم میں! اسے تو موسم کی بجائے اچھا خاصا عذاب الٰہی کہنا چاہئے''۔

اس کے بعد میں نے کسی اور موسم کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک دن میں نے ارادہ کیا کوئی ایسی بات کروں جس میں مرزا کوئی نکتہ پیدا نہ کر سکیں۔ چنانچہ میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہر شخص یہ تسلیم کرتا ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے'' میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ جب مرزا نے اس مسلمہ حقیقت میں بھی نکتہ پیدا کر دیا کہنے لگے ''میاں جو کچھ لوگ کہتے ہیں یا جو کتابوں میں لکھا ہے، اس پر فوراً ایمان نہ لے آیا کرو۔ میری تحقیق کے مطابق تو سورج مشرق کی بجائے شمال مشرق میں طلوع ہوتا اور جنوب مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی دن کمپس

لے کے خود تجربہ کرلو۔تبھی تو میں کہتا ہوں سنی سنائی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے''۔

اس آزمائش کے بعد مرزا کا مزید امتحان لینا بے سود تھا۔اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔لیکن ماہ جنوری میں ایک ایسا وقعہ ہوا کہ مرزا نکتہ چیں کی بجائے نکتہ رس بن گئے۔پندرہ جنوری کی شام کو جب کڑاکے کے سردی پڑ رہی تھی، یک لخت مطلع تاریک ہوگیا۔تھوڑی دیر کے بعد بڑے بڑے اولے پڑنے لگے۔مرزا اور میں ان کے برآمدے میں کھڑے لوگوں کا نظارہ کررہے تھے۔میں نے کہا''اگر کوئی شخص ان اولوں میں گھر جائے تو اس کا خدا ہی حافظ ہے''۔مرزا نے حسب معمول مجھ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جواب دیا''یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے، لیجیے میں آپ کو اولوں میں کھڑا ہو کر دکھاتا ہوں۔میرے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے آنگن میں جا کھڑے ہوئے لیکن جونہی دس بارہ اولے یکے بعد دیگرے ان کی گنجی چاند پر پڑے، چکرا کر زمین پر آرہے اور ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی، انہیں وہاں سے اٹھوا کر بستر پر لٹا دیا گیا۔پانچ گھنٹوں کے بعد جب انہیں ہوش آیا تو ہم نے انہیں ایک نارمل آدمی کی طرح باتیں کرتے سنا۔لطف یہ کہ جو بات ہم کہتے، وہ اس کے ساتھ سو فیصد اتفاق کرتے۔ہم سب حیران تھے کہ یہ معجزہ کس طرح ظہور میں آیا۔مرزا سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انہوں نے ہنس کر فرمایا''معلوم ہوتا ہے یہ اولوں کی کرامت ہے، انہوں نے میرے دماغ کی ڈھیلی چولوں کو کچھ اس طرح کس دیا ہے آئندہ میں کسی بات میں نکتہ پیدا نہیں کرسکوں گا''۔

☆☆☆

نائی

نائی کا پیشہ اتنا قدیم تو نہیں جتنا نانبائی کا لیکن نائی کو موخر الذکر پر یہ فضیلت ضرور حاصل ہے کہ اسے راجا کا لقب عطا کیا گیا ہے کیونکہ اس کے آگے سب کا سر جھکتا ہے اور شاید اسی لقب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ سب کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتا ہے۔اس کا گاہک چاہے جج ہو یا پروفیسر، وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔پروفیسر کی گنجی چاند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کہتا ہے ''آپ تو بال کٹوانے کا خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں۔آپ کی حجامت تو قدرت نے ہی بنا دی ہے''۔اور جج کے بالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہے گا۔''حضور خضاب لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

بھلا جوانی ایک بار جانے کے بعد کبھی واپس آئی ہے''۔

میں پہلے دن سے نائی کی ذہانت کا قائل ہوں۔اس کی باتوں کا تیکھا پن مجھے اس کے استرے کی تیز دھار کی یاد دلاتا ہے۔طبعاً اور فطرتاً نائی ظریف بلکہ ستم ظریف واقع ہوا ہے۔مجھے وہ دہلی کا نائی کبھی نہیں بھولے گا جس نے میرے بال کاٹنے سے پہلے مجھ سے کہا تھا۔''معلوم ہوتا ہے آپ بہت بڑے ادیب ہیں''۔

''تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟''میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پرسوں ایک ادیب بال کٹوانے آئے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے چھ ماہ کے بعد نائی کی دکان کا رخ کیا ہے۔آپ تو شاید پورے ایک سال کے بعد نائی کی خدمات حاصل کرتے ہیں''۔

نائی کے متعلق سب سے عجیب بات یہ نہیں کہ وہ دوسروں کے بال کاٹتا ہے۔

لیکن عموماً اس کے بال بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور نہ یہ کہ اس کی دکان پر ضرورت میں زیادہ کیلنڈر لٹکے رہتے ہیں۔حتیٰ کہ کئی بار محسوس ہوتا ہے یہ نائی کی دکان نہیں کیلنڈروں کے بیوپاری کا شوروم ہے۔بلکہ یہ کہ قینچی کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چلتی رہتی ہے اور بعض اوقات یہ شک ہونے لگتا ہے کہ قینچی اس کے ہاتھ میں ہے یا منہ میں۔شاید وہ اس لیے باتیں بناتا ہے کہ حجامت بنوانے کے دوران گاہک بوریت کے احساس سے بچا رہے یا شاید کوئی اور وجہ ہو۔مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں ایک باتونی نائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے حسرت کو خوفناک قسم کے قصے سنائے اور جب اس سے پوچھا گیا وہ ایسا کیوں کر رہا تو اس نے مسکرا کر کہا حضور! سنا ہے خوفناک قصے اور کہانیاں سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔چونکہ آپ کی ڈاڑھی استرے کی گرفت میں آنے سے گریز کر رہی تھی۔اس لیے میں نے سوچا اگر ڈاڑھی کے بال کھڑے ہو جائیں تو شاید انہیں مونڈتے میں آسانی رہے گی''۔

عام طور پر نائی گفتگو کا آغاز آپ کے بالوں سے کرتا ہے۔اگر اسے پتا چل جائے کہ آپ نے پچھلی بار بال کسی اور نائی سے کٹوائے تھے تو وہ ضرور اپنے ہم پیشہ کے بارے میں ایک آدھ فقرہ کسے گا۔''صاحب برا نہ مانئے گا۔آپ ہرایرے غیرے سے بال مت ترشوایا کیجئے دیکھئے نا۔کم بخت نے آپ کے خوبصورت بالوں کا ستیاناس کر دیا،آپ چاہے کتنا ہی پروٹسٹ کریں

کہ وہ نائی ایراغیرا نہیں ایک مشہور سیلون کا مالک ہے، وہ آپ کے ساتھ کبھی اتفاق نہیں کرے گا اور دلیل پر دلیل پیش کئے جائے گا کہ محض سیلون کھولنے سے کوئی شخص کامیاب حجام نہیں بن جاتا۔ اس فن پر عبور حاصل کرنے کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت ہے۔ پھر وہ آپ کو وضع داری کی ایک دو مثالیں سنائے گا۔ ''صاحب! آج کل تو قدردان ہی لد گئے سرپرستی ورنہ وہ بھی زمانہ تھا کہ جو شخص ایک بار ہم سے حجامت بنوتا، عمر بھر کسی اور نائی کی سرپرستی نہ کرتا تھا۔ مرحوم خان بہادر اللہ رکھا کو تو آپ جانتے ہوں گے۔ تیس برس برابر مجھ سے شیو کراتے رہے۔ ایک بار مجھے میعادی بخار ہو گیا۔ ڈیڑھ مہینا ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ لیکن کیا مجال جو انہوں نے کسی اور حجام کو نزدیک پھٹکنے دیا ہو۔ جب میں روبصحت ہو کر ان سے ملنے گیا تو اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے۔ ''لو میاں یہ رہی تمہاری امانت دیکھو، اسے کتنا سنبھال کر رکھا ہے۔ تو صاحب یہ تھی وضعداری۔ ان دنوں تو لوگ سستے نائیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ فن کی قدر کوئی نہیں کرتا''۔

ماضی کے سمندر میں غوطہ لگا کر عجیب غریب یادوں کے سنگریزے برآمد کرنا قریب قریب ہر نائی کا شغل ہوتا ہے۔ میرا نائی جب ماضی اور حال کا موازنہ کرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے ''بابو جی! کیا بتائیں۔ آج سے چالیس برس پہلے نائی کا سماج میں کتنا اونچا درجہ ہوا کرتا تھا۔ اللہ بخشے مرحوم دادا جان فرمایا کرتے تھے کہ پنڈت کے بعد سب سے زیادہ عزت نائی کی ہوا کرتی تھی۔ خاص کر دیہات میں تو نائی کو مشیر خاص کا رتبہ حاصل تھا۔ کسی تقریب کا انتظا رنا ہوتا یا بیاہ شادی کے متعلق مشورہ مطلوب ہوتا تو سب سے پہلے نائی کو طلب کیا جاتا۔ بقول دادا جان، جب تک نائی کسی نوجوان کے چال چلن کی تصدیق نہ کرتا، اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی، وہ تو جہاں تک فرماتے تھے جب تک نائی یہ نہ کہہ دے، لڑکا نوجوان ہو گیا ہے، اسے نوجوان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے زمانے کی شادیاں دیرپا ثابت ہوتی تھیں۔ آج کل کی طرح نہیں کہ چٹ منگنی ٹ بیاہ اور پھٹ طلاق۔ آج کل کے چھوکرے تو ماں باپ کو بھی اطلاع نہیں دیتے کہ شادی کر رہے ہیں، بیچارہ نائی کس کھیت کی مولی ہے''۔

شیو کرتے وقت میرا نائی باتوں میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ

بڑی بے دھیانی سے استرے کا استعمال کر رہا ہے۔ایسی صورت میں چہرے کا لہولہان ہو جانا لازمی ہے، جب میں درد سے بلبلاتا ہوں وہ فوراًزخموں پر پھٹکری گھسانے لگتا ہے۔ دوایک منٹ چپ رہنے کے بعدوہ پھر کہتا ہے''ہاں تو بابوصاحب میں یہ عرض کرنے کی جرات کروں گا کہ نائی کے علاوہ نائن کوبھی بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ تو شاید آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ دلہن جب پہلی بار سسرال جاتی تھی تو نائن اس کے ہمراہ ضرور ہوا کرتی تھی۔اس میں بھی ایک نکتہ تھا۔مطلب یہ تھا کہ دولہا دولہن پہلے روز ہی ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف نہ ہو جائیں بلکہ آہستہ آہستہ کھلیں۔ایک اور فائدہ یہ تھا کہ دلہن کو مفارقت کا جوزخم لگتا تھا، نائن کی موجودگی اس پر مرہم کا کام کرتی تھی''۔

''وہ تو ٹھیک ہے''میں فریاد کرتے ہوئے کہتا ہوں''لیکن یہ جو تم نے میرے چہرے پر ابھی ابھی چھ سات زخم لگائے ہیں۔ان کے لیے مرہم کہاں سے ملے گا''۔

وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتا ہے''خدا کی قسم آپ بڑے زندہ دل ہیں۔ان کی پروا مت کیجئے۔ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں''۔

اور وہ ایک بار پھر زخموں پر پھٹکری گھسانے کا عمل دہراتا ہے لیکن چونکہ زیادہ دیر چپ رہنا اس کی کمزوری نہیں ہے، اس لیے چہرے پر دوبارہ صابن لگاتے ہوئے کہتا ہے۔''بابو جی! پرانے زمانے کے حجام غضب کے جراح بھی ہوا کرتے تھے۔اللہ بخشے مرحوم دادا جان تو جراحی کے فن میں استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ولایت پاس سرجن بھی ان کے آگے پانی بھرتے تھے۔ایک دفعہ تو انہوں نے ایک جرمن سرجن سے ٹکر بھی لی تھی۔وہ کہنے لگا۔''تم کالا آدمی کیا جانتا سرجری کیا بلا ہے'' مرحوم دادا جان نے ایک خرگوش منگوایا اور استرے سے اس کا ایک کان اڑا دیا۔پھر جرمن سرجن سے کہا۔اگر تمہیں اپنے علم پر اتنا زعم ہے تو کٹے ہوئے کان کو دوبارہ اس کی جگہ پر لگا کر دکھاؤ۔سرجن نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔دادا جان نے جیب سے مرہم کی ایک ڈبیا نکالی۔تھوڑا سا مرہم کٹے ہوئے کان پر لگایا اور اسے اسی جگہ پر چپکا دیا۔جہاں سے وہ کاٹا گیا تھا، جرمن سرجن دم بخود ہو گیا۔

اپنے نائی کا یہ قصہ سن کر ہم بھی دم بخود ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ اس کا دادا حجام تھا یا جادوگر اور اسی وقت ہمیں خیال آیا ہے، دراصل ہر حجام جادوگر ہوتا ہے کیونکہ جب بال حد

سے بڑھ جاتے ہیں اور آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر وحشت ہونے لگتی ہے اور اپنے چہرے پر کسی ریچھ کے چہرے کا گمان ہونے لگتا ہے، اس وقت وہ اپنی جادو کی قینچی اور استرے کی مدد سے ہمیں ایک بات پھر انسان کا چہرہ عطا کرتا ہے اور زبان حال سے کہتا ہے۔

ہم کو دعائیں دو تمہیں انسان بنا دیا!

☆☆☆

آپ بیتی

مشہور انگریزی نقاد ڈبلیو ایچ ہڈسن کا قول ہے کہ ہر شخص کم از کم ایک دلچسپ کتاب لکھ سکتا ہے اور وہ ہے اس کی آپ بیتی۔ بہت سے کلیوں کی طرح ہڈسن کا یہ کلیہ بھی مبالغے پر مبنی ہے کیونکہ ایک عام آدمی کی زندگی اتنی سپاٹ اور غیر دلچسپ ہوتی ہے کہ کوئی قاری اس میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے، جب تک کسی شخص کی زندگی سنسنی خیز یا عبرت انگیز واقعات سے عبارت نہ ہو، اسے میر کے اس شعر پر اکتفا کرنی چاہیے۔

کہیں کیا کوئی ہم سے پوچھے جو میر
تم آئے تھے دنیا میں کیا کر چلے

یاد رہے، ناخدائے سخن حضرت میر تقی میر نے نوے سال کی عمر پائی اور سات دواوین اپنی یادگار چھوڑے۔ اس کے باوجود کسر نفسی کا یہ عالم کہ فرماتے ہیں، ہم نے کوئی کارنمایاں نہیں کیا۔

میری زندگی سنسنی خیز واقعات سے یکسر خالی ہے میں نے کبھی محبت کی نہ بلیک مارکٹنگ نہ کسی کو قتل کیا اور نہ خود قتل ہونے سے بال بال بچا، نہ کبھی صحرا کا رخ کیا اور نہ پاگل خانے کا، وزیر بنا نہ سفیر، حسن کا تعاقب کیا نہ جاہ و منصب کا، عمر بھر تندرست رہا نہ بیمار، نہ فارغ البال ہوں اور نہ رہیں ستم ہائے روزگار۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر میں اپنی مختصر آپ بیتی لکھ رہا ہوں، تو اس کی وجہ جواز محض یہ ہے کہ اسے پڑھ کر قارئین عبرت پکڑیں اور میری ایسی زندگی بسر کرنے سے گریز کریں۔

ایک روایت کے مطابق میں 27 جون 1910ء اور دوسری کے مطابق یکم نومبر 1911ء کو پیدا ہوا۔ میرے والد ہری رام کپور مرحوم ضلع لائل پور کے ایک گاؤں میں جس کا نام چک

نمبر 498 تھا، پٹواری تھے۔ جس گاؤں میں میرا بچپن بسر ہوا، وہ تین چیزوں کے لیے مشہور تھا۔ بلوچ، ڈھول اور کتے، ان تینوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بلوچ نہایت نیک اور اللہ والے لوگ تھے۔ میں نے ان سے زیادہ خدا ترس انسان آج تک نہیں دیکھے۔ عام طور پر وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے جب کوئی نوجوان برائی کی طرف راغب ہوتا تو بڑے بوڑھے اسے سمجھاتے ''خدا اور رسول کو کیا منہ دکھاؤ گے؟'' یہ محض ان کا تکیہ کلام ہی نہیں تھا بلکہ اصول زندگی بھی۔ انہی ان پڑھ بلوچوں نے مجھے انسانیت کا پہلا سبق پڑھایا۔ بلوچ جتنے اچھے تھے کتے اتنے ہی بے شعور۔ وہ ہر وقت اور ہر شخص کو دیکھ کر بھونکا کرتے۔ ان کی اس بدتمیزی پر میں اکثر دانت پیس کر رہ جاتا۔ چنانچہ مجھے کتوں سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ آج تک نجیب الطرفین سے نجیب الطرفین کتے کو پسند نہیں کر سکا۔ کتوں کے علاوہ دوسری قباحت ڈھول تھی۔ موسم گرما میں جب ڈھول کے جھکڑ چلتے اور سر اور منہ خاک آلودہ ہو جاتے، تو اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ ڈھول سے ہر روز واسطہ پڑنے کا یہ ردعمل ہوا کہ میں تمام خشک چیزوں کو ناپسند کرنے لگا جیسے خشک نثر۔ خشک آدمی اور خشک موسم!

میری ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول میں ہوئی۔ میرے استاد مولوی محمد عیسیٰ، فارسی اور اردو کے عالم تھے۔ درسی کتب کے علاوہ انہوں نے مجھے گلستان اور بوستان کے رموز سے آگاہ فرمایا۔ کبھی کبھی قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ آسان اردو میں سمجھانے کے بعد کہتے۔

''دیکھو اتنے تھوڑے لفظوں میں کتنی بڑی بات کہی گئی ہے''۔

میں نے میٹریکولیشن کا امتحان 1928ء میں گورنمنٹ سکول کمالیہ سے پاس کیا اور پنجاب بھر میں دوم رہا۔ انٹرمیڈیٹ ڈی ایم کالج موگا اور بی اے، ڈی اے وی کالج لاہور سے کیا۔ اور یونیورسٹی میں انگریزی اور سنسکرت کے مضامین میں اول رہا۔ ایم اے (انگریزی) کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں سید احمد شاہ بخاری، پطرس مرحوم کا شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بخاری صاحب کی پرکشش شخصیت سے میں نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ موصوف نہ صرف انگریزی زبان کے مانے ہوئے مقرر اور استاد تھے بلکہ اردو زبان کے ایک سلجھے ہوئے مزاح نگار بھی۔ بخاری صاحب سے میں نے ہر فرسودہ روایت اور ہر بے ہودہ شخص کا مضحکہ اڑانے کا فن سیکھا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے ''جب کوئی چیز یا انسان زاویہ قائمہ کی

بجائے زاویہ منفرجہ یا زاویہ حادہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو مزاح کا موضوع بن جاتا ہے اور مزاح کا ذکر کرتے وقت کہتے۔ ابھی اس کا بچپنا ہے تو اسے لڑکپن کی منزل تک پہنچنے کے لیے کم از کم پچاس سال کا عرصہ درکار ہے۔ بخاری کی تحریک پر ہی میں مزاح نگاری کی طرف مائل ہوا اور اگرچہ ان دنوں میری حیثیت نوگرفتار کی سی تھی، انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔

1931ء میری زندگی کا ایک اہم سال ہے۔ تب میں تھرڈ ائر میں پڑھتا تھا۔ والدین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اب نوجوان ہو گیا ہوں (حالانکہ نوجوان میں عمر کے کسی حصے میں نہیں تھا) میری شادی کر دی۔ ایم اے پاس کرنے سے پہلے میں ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔ میری اہلیہ پشاوتی ایک متوسط گھرانے میں کہ جو قصبہ کوٹ مومن ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتا تھا، پیدا ہوئیں۔ چونکہ قصبے میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس لیے وہ تعلیم سے بے بہرہ رہیں۔ ہمارے سات بچے ہیں (حسن اتفاق سے میں سات کتابوں کا مصنف ہوں) تین لڑکے چار لڑکیاں۔ ہماری ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہے کیونکہ ہم میاں بیوی نے شروع سے یہ عہد کیا تھا کہ ہم ایک دسرے پر کبھی نکتہ چینی نہیں کریں گے۔ اپنے بجائے ہم ہمسایوں یا قومی راہ نماؤں کو اپنی تنقید کا نشانہ مشق بنائیں گے۔ پچھلے 23 سال سے ہم اس عہد پر قائم ہیں۔ جب ہم کسی میاں بیوی کو جھگڑتے یا ایک دوسرے سے روٹھتے دیکھتے ہیں، ہمیں ان پر بے حد رشک آتا ہے اور دبی زبان میں ہم اس حسرت کا اظہار کرتے ہیں، کاش ہمیں بھی خدا لڑنے یا روٹھنے کی توفیق دیتا۔

1934ء سے جب میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا، میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ کوشش کے باوجود مجھے کہیں ملازمت نہ ملی۔ آخر ڈی اے وی کالج لاہور میں پچھتر روپے ماہوار پر کمپوزیشن ٹیچر مقرر ہوا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد چھانٹی میں آ گیا۔ اب میں نے پرائیوٹ ٹیوشن کو ذریعۂ معاش بنایا اور ایک بورڈنگ ہاؤس (ہندو ہوسٹل لاہور) میں رہنے لگا۔ یہاں نہایت ڈرامائی حالات میں کرشن چندر سے ملاقات ہوئی۔ بخاری صاحب کے بعد کرشن دوسرا ادیب تھا۔ جس نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی۔ سب سے پہلا طنزیہ مضمون کرشن چندر کے افسانے ''یرقان'' پر پیروڈی بعنوان ''خفقان'' لکھا۔ انہی دنوں مجھے ڈی اے وی کالج لاہور میں دوبارہ

ملازمت مل گئی جہاں میں تقسیم ہندوستان تک انگریزی کا مضمون پڑھاتا رہا۔

میرا دوسرا مضمون (اخبار بینی) چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ ''شیرازہ'' میں شائع ہوا۔ تیسرا مضمون رسالہ ''ادب لطیف'' کے سالنامہ (1938ء) میں چھپا۔ عنوان تھا ''چینی شاعری'' لیکن جس مضمون کا سب سے زیادہ شہرہ ہوا اور جس نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچادیا، وہ غالباً ترقی پسند شعراء کی ایک مجلس میں، تھا۔ یہ 1962ء میں رسالہ ادبی دنیا میں چھپا اور چھپنے سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس مضمون سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

میری پہلی تصنیف ''سنگ وخشت'' اسی سال مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی۔ اسے پطرس کے علاوہ جناب احتشام حسین، جناب عبادت بریلوی اور خواجہ غلام السیدین نے حوصلہ افزاء الفاظ میں سراہا۔ اس کے بعد کی تصنیفات کے نام ہیں۔ ''شیشہ وتیشہ'' (1944ء) ''جنگ ورباب'' (1946ء) ''نوک نشتر'' (1949ء) ''بال وپر'' (1952ء) ''زم گرم'' (1957ء) اور ''گرد کارواں'' (1960ء)

میرے تین مضامین پر اچھے خاصے ہنگامے ہوئے۔ پہلا مضمون ''اہل زبان'' تھا۔ یہ ادب لطیف کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس میں یوپی اور دہلی کے نام نہاد اہل زبان پر چند کراری چوٹیں تھیں۔ اس کا چھپنا تھا کہ دہلی اور یوپی میں حشر بپا ہوگیا۔ جناب شاہد احمد، مدیر ''ساقی'' نے مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے مجھے بدزبان اور کج مج بیان کے خطابات سے نوازا اور لکھا ''آج خاک پنجاب اہل زبان کے منہ آرہی ہے لیکن اسے آخر منہ کی کھانی پڑے گی'' کچھ گھبرا اور کچھ بھنا کر میں نے اہل دہلی پر ایک اور طنزیہ مضمون بعنوان ''نے چراغے نے گلے'' گھسیٹ مارا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دہلی اور پنجاب کے رسائل میں ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کو وہ وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ مزا آ گیا۔ تیسرے مضمون کا عنوان ''مطالبات'' تھا۔ یہ حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔ اس میں چند زندہ لوگوں کے مضحکہ خیز مطالبات کا ذکر تھا۔ مثلاً ایک صاحب کا مطالبہ تھا کہ مجھے اقبال کا سب سے بڑا جلیس قرار دیا جائے کیونکہ انہوں نے میرا ذکر مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری انکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اتفاق سے اسی مضمون میں قیام پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کی گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کی آڑ لے کر خواب اپنے دل کا عبار نکالا اور مسلم لیگ کے روز ناموں میں مجھے کشتنی اور گردن زدنی ٹھہرایا۔ یہ طوفان تب تھما جب میں نے گڑ گڑا کر معافی مانگی اور مضمون کو تلف کرنے کا وعدہ کیا۔

1947ء میں میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد میں نے فیروز پور میں پناہ لی اور اکتوبر 1947ء میں ڈی ایم کالج ہوگا میں یہ سمجھتے ہوئے کہ جب میکدہ چھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید نوکری کر لی۔ شروع شروع میں طبیعت بہت گھبرائی۔ لاہور اور موگا میں بعد المشرقین تھا۔ کہاں لاہور کی رنگینیاں، مجلسیں اور ہنگامے اور کہاں موگا کا ایسا نیم ریگستانی قصبہ جہاں سر کنڈوں اور ریت کے انبار کے علاوہ کوئی قابل دید چیز نہیں تھی۔ بار ہا حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہانے کو جی چاہا۔ لیکن سنبھلتے سنبھلتے جب طبیعت سنبھل گئی تو نئے ماحول سے سمجھوتا کرلیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ گو لاہور کو چھوڑے سترہ سال ہو گئے، اس کی حسین یادیں آج تک میرا تعاقب کررہی ہیں۔ لاہور کا تصور کرتے ہی دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور بے اختیار زبان پر ناسخ کا یہ شعر آ جاتا ہے۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

موگا میں ادبی ماحول کی جستجو ظلمات میں خورشید کی تلاش کے مترادف ہے۔ یہاں لوگ آرٹ اور ادب کی بجائے شراب اور دفعہ 302 میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں وقت گزر نہیں رہا کٹ رہا ہے۔ دن کے وقت کالج میں پڑھانا، شام کو لمبی سیر، رات کو مطالعہ، ذہنی خودکشی کرنے کے لیے یہ نہایت موزوں شہر ہے۔ یہاں آ کر محسوس ہوتا ہے کہ ''دماغ'' نام کی کوئی چیز نہیں، انسان محض جسم ہی جسم ہے۔

پچھلے سترہ سال سے میں موگا میں مقیم ہوں۔ دوست احباب اکثر سوال کرتے ہیں۔ میں نے جنت سے ہجرت کرنے کے بعد اس جہنم کو کیوں اپنا مسکن بنایا۔ میرے پاس سوال کا کوئی جواب نہیں ماسوا اس کے کہ جب تک ہندوستان، لاہور کا ثانی پیدا نہیں کرتا، میرے لیے ہندوستان کے تمام شہر اور قصبے برابر ہیں۔ پاکستانی احباب پوچھتے ہیں ''ہمیں ملنے کے لیے لاہور کیوں نہیں

آتے''۔انہیں جواب میں لکھ بھیجتا ہوں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار نہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یہ آپ بیتی نامکمل ہوگی، اگر میں قارئین کو اپنی ذات سے متعلق چند ضرور تفاصیل سے آگاہ نہ کروں۔ میں ذات کا کھتری ہوں۔ پیشہ آبا یقیناً سپہ گری نہیں، بلکہ دکانداری تھا۔ میرا قد پانچ فٹ گیارہ انچ، وزن ڈیڑھ من اور رنگ گندمی ہے، جسم اکہرا اور بال کھچڑی ہیں۔ جھک کر بیٹھتا، چلتا اور سلام کرتا ہوں۔ کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتا۔ ترقی پسند ہوں نہ رجعت پسند۔ اگر کچھ ہوں تو اعتدال پسند، سگریٹ نوش اور گوشت خور ہوں۔ اردو میں لکھتا ہوں، پنجابی میں بولتا اور انگریزی میں پڑھاتا ہوں۔ میں نے اپنی فراغت کا معتد بہ حصہ کالج کی درسی کتب کی شرح لکھنے میں ضائع کیا ہے۔ میرے مشاغل کتابیں اکٹھی کرنا، سیر اور احباب کو بنانا ہیں۔ خدا کی ہستی کا قائل ہوں۔ اگرچہ اس کے بھیجے ہوئے کسی اوتار یا پیغمبر پر ایمان نہیں لا سکا۔ اپنے علاوہ ہر ادیب کو ادیب سمجھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کسی زندہ ادیب کو اقبال اور پریم چند کا ہم پلہ نہیں سمجھتا۔ قسمت احباب اور حکومت کا شاکی ہوں کہ ان تینوں نے میرے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا، جس کا میں مستحق تھا۔ حالانکہ عمر بھر میں زندگی سے اور زندگی نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ اس کے باوجود میرا نظریہ حیات قنوطی ہے رجائی نہیں۔

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست　　شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

☆☆☆

میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ

زندگی واقعات اور حادثات کا مجموعہ ہے لیکن ہر واقعہ کی حیثیت ایک سی نہیں ہوتی۔ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان بہت جلد بھول جاتا ہے یا کم از کم بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے جیسے کسی دوست سے قرض لینے کا واقعہ۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں یاد کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً استاد یا بیوی سے پہلی بار پٹنے کا واقعہ۔ شاید اسی قسم کے واقعہ کے متعلق کسی شاعر نے کہا تھا۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اور کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں بھلانا چاہیں بھی تو بھلا نہیں سکتے۔مثال کے طور پر کسی پر طبیعت آنے کا واقعہ کہ جسے ''دل کے جانے'' کا واقعہ بھی کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں میر کا مشہور شعر ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا

میری زندگی کے نا قابل فراموش واقعہ کی نوعیت ان سب واقعات سے مختلف ہے۔اس کا عشق و محبت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ محبت میں نے کی ہی نہیں۔ دراصل کسی نے اس کی اجازت ہی نہیں دی۔استاد اور بیوی کی مار پیٹ سے میں اس لیے بچتا رہا کہ میں نے ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔قرض اس لیے نہیں لیا کہ جن احباب سے لے سکتا تھا، وہ خود مقروض تھے۔یہ واقعہ ایک غیر معمولی ملاقات سے متعلق ہے کہ جس نے مجھے مزاح نگار بنا دیا۔

یہ اکتوبر 1936ء کا ذکر ہے۔میں ان دنوں بے کار تھا اور ایک سستے بورڈنگ ہاؤس (ہندو ہوسٹل لاہور) میں رہا کرتا تھا۔میرے کمرے کی دائیں طرف ایک اسکول ماسٹر تبرا رہتے تھے اور بائیں طرف ایک نوجوان کہ جس سے میری صاحب سلامت تک نہیں تھی۔تبرا صاحب میری طرح اردو ادب کے دلدادہ تھے اور اکثر ہم دونوں ادبی موضوعات پر بحث کیا کرتے۔ایک بار میں نے کسی کالج میں لیکچرشپ کے لیے درخواست دی۔درخواست کے ہمراہ مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھجوانا تھا۔میں اسے حاصل کرنے کے لیے اپنے استاد پروفیسر ڈکنسن صدر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور کی خدمت میں حاضر ہوا۔موصوف کی مخبوط الحواسی مشہور تھی۔انہوں نے مجھے اپنا شاگرد تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔کہنے لگے ''جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے آپ کو کبھی نہیں پڑھایا''۔میں نے انہیں یاد دلایا کہ میں بلراج ساہنی کا ہم جماعت ہوں۔بلراج ساہنی کے نام پر وہ چونکے کیونکہ وہ ان کا عزیز ترین شاگرد تھا۔انہوں نے سرٹیفکیٹ دینے کی حامی بھری۔بشرطیکہ میں ان کے کمرے سے فوراً باہر چلا جاؤں اور ایک گھنٹے کے بعد پھر آؤں۔وقت کاٹنے کے لیے میں کالج لائبریری چلا گیا اور رسائل کی ورق گردانی کرنے

لگا۔اچانک میری نظر رسالہ ''ہمایوں'' کے تازہ شمارے پر پڑی۔''ہمایوں'' کی ان دنوں ادبی دنیا میں دھوم تھی اور اس کا شمار چوٹی کے رسالوں میں ہوتا تھا۔میں اس میں ایک شائع شدہ مضمون پڑھنے لگا۔عنوان تھا۔''لاہور سے بہرام گلہ تک''اور مضمون نگار تھے کرشن چندر کہ جن کا نام میں پہلی بار سنا تھا۔مضمون کا ابتدائی حصہ مجھے اتنا پسند آیا کہ میں نے اسے آخر تک پڑھنے کا فوراً فیصلہ کیا، حالانکہ وہ کافی طویل تھا۔دو چیزوں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔پختہ اور خوبصورت نثر اور طنزومزاح کی چاشنی۔

مضمون ختم کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ایک نیا ستارہ آسمان ادب پر طلوع ہوا ہے، جو بہت جلد ماہ کامل بنا چاہتا ہے۔میں نے پروفیسر ڈکنسن سے سرٹیفیکٹ لیا اور اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔میں جلد از جلد ہسٹ ہوسٹل پہنچنا چاہتا تھا تا کہ تبرا صاحب سے اس نئے مضمون نگار کا ذکر کروں۔اتفاق سے وہ اپنے کمرے میں موجود تھے میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا''تبرا صاحب! آج ایک نئے مضمون نگار کا پتا چلا ہے۔بخدا نثر لکھتا ہے کہ جادو جگاتا ہے۔اس کا ایک مضمون''ہمایوں''میں چھپا ہے۔اگر آپ نے نہیں پڑھا تو ضرور پڑھئے۔

لیکن وہ ہے کون؟''

''کوئی نووارد ہے۔نام ہے کرشن چندر''۔

''کہیں آپ اس کے مضمون''لاہور سے بہرام گلہ تک'' کا تو ذکر نہیں کر رہے؟''

''تو آپ نے یہ مضمون پڑھا ہے''۔

''مضمون بھی پڑھا ہے، مضمون نگار کو بھی جانتا ہوں''۔

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے''۔

''میرا تو خیال ہے آپ بھی اسے جانتے ہیں''۔

''تو گویا آپ مجھے بنا رہے ہیں''۔

''ارے بھئی نہیں۔وہی تو کرشن چندر ہے، جو آپ کے ساتھ والے کمرے میں رہتا ہے''۔

''آپ کا مطلب ہے وہ پراسرار خوش پوشاک شخص جو کسی سے بات چیت نہیں کرتا''۔

''ہاں ہاں۔بالکل وہی''۔

''تعجب''۔

''آیئے آپ کا اس سے تعارف کرادوں''۔

اور تبرا صاحب کشاں کشاں مجھے کرشن چندر کے کمرے میں لے گئے۔ چھریرا بدن، درمیانہ قد، گندمی رنگ خوبصورت آنکھیں۔ یورپین لباس میں ملبوس کرشن چندر مجھے ادیب بالکل نظر نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک نوجوان فلسفی ہے جو قبل از وقت بوڑھا ہوگیا ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ میں نے اس کے اسلوب بیان کی تعریف کی۔ وہ نہ مسکرایا اور نہ اس نے میرا رسمی شکریہ ادا کیا۔ بس کبھی کبھی کھانس لیتا تو تھوک دیتا۔ ایک آدھ بار اس نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر مسکرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے اس سے مل کر خاصی مایوسی ہوئی اور بالکل یقین نہ آیا کہ وہ مضمون اس نے لکھا تھا۔

شام کے وقت میں دوسری بار اس کے کمرے میں گیا اور اس سے کہا ''خدارا اب تو سچ سچ بتا دیجئے کہ اس مضمون کے مصنف آپ ہی ہیں''۔

''آپ کو شک کیوں ہوا'' اس نے مدھم آواز میں پوچھا

''مجھے اس مضمون اور آپ میں کوئی مناسبت نظر نہیں آئی''۔

''وہ کیسے''۔

''آپ جواں سال ہیں اور وہ مضمون کسی منجھے ہوئے ادیب کی تخلیق ہے''۔

''نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی مضامین لکھے ہیں''۔ اس نے میری جانب ''ہمایوں'' کے کچھ پچھلے شمارے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ انہیں لے جا سکتے ہیں''۔

میں نے اس کے مطبوعہ مضامین پڑھے اور میرا یقین اور بھی پختہ ہوگیا کہ وہ عظیم فن کار ہے۔ اس دن سے ہم گہرے دوست بن گئے۔ ہمارا زیادہ وقت ایک دوسرے کی معیت میں گزرنے لگا۔ کرشن چندر میری ضد واقعہ ہوا تھا۔ مجھے نچلا نہ بیٹھنا پسند تھا۔ اسے غیر سنجیدگی سے وحشت ہوتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے اسے سنجیدگی سے نجات دلانے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔ میں اس کی ہر بات کا مذاق اڑانے لگا۔ مثال کے طور پر وہ اقبال کا پرستار تھا۔ مجھے بھی شاعر مشرق سے بے پناہ عقیدت تھی۔ لیکن میں اسے محض چڑانے کے لیے اقبال کا ہر شعر چٹکیوں میں اڑاتا۔ کبھی کہتا خیال فرسودہ ہے۔ فلاں شاعر سے چرایا گیا ہے۔ کبھی اعتراض کرتا زبان سے پنجابیت ٹپکتی ہے۔ کرشن چندر مشتعل ہو کر بحث کرنے لگتا اور میں اسے ادھر ادھر

کی باتوں میں الجھا کرلا جواب کا دیتا۔

ایک دن جب ہم غالب کی شاعری پر بحث کر رہے تھے۔اس نے غالب کا کوئی شعر پڑھا۔میں نے اسے بتاتے ہوئے کہا''معاف کیجئے یہ شعر غالب کا نہیں ساگر کا ہے''وہ حسب معمول دلائل پیش کرنے لگا کہ ساگر نام کا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا''ہوا کیسے نہیں۔معلوم ہوتا ہے آپ نے اس حیدرآبادی محقق کا تھیسیس نہیں پڑھا،جس نے ثابت کیا ہے کہ غالب کا سارا دیوان ساگر کا لکھا ہوا ہے۔یہ شخص عثمان ساگر کے کنارے رہتا تھا،اور غالب کا استاد تھا۔اسے یقین نہ آیا۔لیکن اس نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا۔''تم باتیں بنا سکتے ہو۔تمہاری باتیں تیکھی بھی کافی ہوتی ہیں۔تم طنز نگار کیوں نہیں بن جاتے''۔

''بن تو جاؤں۔لیکن مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا''۔

''لکھنا لکھنے سے ہی آئے گا''۔

چنانچہ میں نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسی کے مشہور افسانے''یرقان''پر ایک پیروڈی لکھی۔عنوان تھا''خفقان''وہ اسے پڑھ کر بہت خوش ہوا۔اور اس نے مجھے مشق جاری رکھنے کی تلقین کی۔اس طرح میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

اس واقعہ کی حیثیت میری زندگی کے ریگ زار میں نخلستان کی طرح ہے جس کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں میں بیٹھ کر اتفاقات زمانہ پر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں واقعی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موسیٰ آگ لینے جائیں اور انہیں پیغمبری مل جائے۔

☆☆☆

جانور کتنے خوش نصیب ہیں

کہتے ہیں صرف انسان ہی ہنسنے والا جانور ہے۔ میری رائے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ انسان ہی صرف وہ جانور ہے جس پر ہنسا جا سکتا ہے۔آپ کہیں گے بندر کی حرکتوں پر بھی تو ہنسی آتی ہے۔میں عرض کروں گا۔آنی ہی چاہیے کیونکہ بقول ڈارون، بندر انسان کا جد امجد ہے۔بندروں کی حرکتیں عجیب وغریب ضرور ہوتی ہیں،لیکن مضحکہ خیز نہیں۔اب آپ اس کو ہی لیجئے کہ ذہین سے ذہین بندر غزل نہیں کہتا اور اگر کہتا ہے تو دوسروں کو سنا کر بور نہیں کرتا۔ذرا ایک

لحظہ کے لیے فرض کیجئے کہ ایک بندر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "حضرات! یہ غزل رات کو ہوئی تھی۔ مطلع میں حسب معمول میں نے بندریا کی بے رخی کی شکایت کی ہے۔ پہلے شعر میں اپنی بے خوابی اور اختر شماری کا ذکر۔ تیسرے میں یہ گلا کہ مجھے موت اب تک کیوں نہیں آئی، چوتھے میں اپنی دیوانگی کا تذکرہ، پانچویں میں بندریا کو روز محشر رسوا کرنے کی دھمکی، آخری شعر میں خودکشی کا ارادہ اور مقطع میں دن رات شراب پینے کا منصوبہ۔"

کیا بندر اس کی غزل سننے کے بعد یہ نہیں کہیں گے صاحب۔ جسے آپ غزل کہہ رہے ہیں۔ اس کا نام "کچھ ادھر ادھر کی" ہونا چاہئے۔

اب ایک ایسے کتے کا تصور ذہن میں لائیے جو بدقسمتی سے افسانہ نویس ہے۔ وہ دوسرے کتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "میرے افسانے کا ہیرو جو کہ ایک کتا ہے، آلام روزگار سے گھبرا کر گھر سے نکل پڑتا ہے۔ سڑک پر چلتے ہوئے اسے خیال آتا ہے اگر وہ اچھی نسل کا ہوتا تو اس کی زندگی کتنے آرام سے گزرتی۔ اتنے میں اسے ایک کتیا نظر آتی ہے جس سے اسے نگاہ اولین میں محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اظہار عشق کرنا چاہتا ہے لیکن اول تو اسے اس مقصد کے لیے الفاظ نہیں ملتے دوسرے وہ ڈرتا ہے کہ اگر کسی اور کتے نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔ وہ ایک پلے کے ذریعے کتیا کو پیغام محبت بھجواتا ہے۔ کتیا کے والدین کو جب اس حادثے کا علم ہوتا ہے، وہ مار مار کر کتے کو بھرکس نکال دیتے ہیں۔ جب اس کے زخم بھر جاتے ہیں تو وہ ایک ایسی کتیا کا تعاقب کرنے لگتا ہے، جو عشق کو گناہ کی بجائے توفیق سمجھتی ہے۔ آخر میں ان دونوں میں شادی ہو جاتی ہے۔

کیا یہ کہانی سن کر باقی کتے یہ نہیں کہیں گے "واہ حضرت! اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا"۔ اب یہ فرض کیجئے کہ ایک گیدڑ دوسرے گیدڑ کے پاس جاتا ہے اور ان دونوں میں کچھ اس قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔

"کہئے کیا حال ہے؟"۔

"آپ کی عنایت ہے"۔

"بھابی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے"۔

"بچہ بالکل ٹھیک ہے نا"۔

''جی ہاں''۔

''آپ کا مزاج کیسا ہے''۔

''آپ کی دعا ہے''۔

''اور بھابی بالکل راضی خوشی ہیں''۔

''جی ہاں''۔

''اور بچہ بھی خوش وخرم ہے''۔

''جی ہاں''۔

''تو اور فرمائیے۔آپ بالکل مزے میں ہیں نا''۔

''جی ہاں''۔

''بھابی بھی بالکل بخریت ہیں''۔

''جی ہاں''۔

''اور بچہ بھی''۔

''جی ہاں''۔

''اچھا تو اگر آپ کے پاس ایک آدھ چچوری ہڈی ہو تو عنایت کیجئے''۔

کیا دوسرے گیدڑ کے چلے جانے کے بعد پہلا یہ نہیں سوچے گا اگر چچوری ہڈی ہی چاہیے تھی تو تین بار ہمارا، ہماری اہلیہ اور ہمارے بچے کا حال پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔

اب ایک بار اور فرض کیجئے کہ کوئی ہاتھی مصور ہے اور مصوری کے جدید ترین اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنا تازہ شہکار کسی اور ہاتھی کو دکھاتا ہے۔اس نے چنار کے درخت کی تصویر بنائی ہے،لیکن اپنے ساتھی سے کہتا ہے۔ یہ ہتھنی کی تصویر ہے۔اس کا دوست اعتراض کرتا ہے کہ درخت اور جانور میں کافی فرق ہوتا ہے لیکن وہ برابر اصرار کیے جاتا ہے۔''نہیں صاحب، یہ درخت ہرگز نہیں ہتھنی ہے'' کیا معترض اس مصور سے یہ نہیں کہے گا۔''بندہ پرور! یا تو آپ نے چنار کا درخت نہیں دیکھا یا آپ ہتھنی کی شکل وصورت سے ناواقف ہیں''۔

آخری بار فرض کیجئے کوئی ریچھ جو واعظ واقع ہوا ہے، باقی ریچھوں کو تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے ''حضرات! میں آپ کے جنگل میں تیسری بار آیا ہوں۔میرے ساتھ مل کر تین بار نعرہ

لگائیے ''جے جنگل'' اس دفعہ مجھے یہاں آ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ مجھے افسوس ہوا کہ آپ فرسودہ اقدار کی بجائے جدید اقدار پر ایمان لے آئے ہیں۔ حضرات! ضعیف الاعتقادی ہماری قومی میراث ہے، اسے خیر باد کہنے سے پہلے آپ کو کچھ سوچنا چاہیے تھا۔ آپ کو ان پرانی کتب کا شب و روز مطالعہ کرنا چاہیے جو آپ کے دور جہالت کی یادگار ہیں۔ قدم آگے بڑھانے سے ہی آگے بڑھتا ہے اور دوبارہ یاد رکھیے اگر آپ نے اب بھی کروٹ نہ بدلی تو آپ کبھی کروٹ نہیں بدل سکیں گے۔ اور......اور......یعنی......یعنی تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

یہ تقریر سن کر کس ریچھ کا دل نہیں چاہے گا کہ وہ جنگل سے بھاگ کر کسی شہر میں پناہ ڈھونڈے۔ جانوروں کی مندرجہ بالا حرکتوں پر شاید آپ مسکرائیں گے لیکن حیرانی کی بات ہے، آپ ہر روز انسانوں کو ان سے بھی مضحکہ خیز حرکتیں کرتے دیکھتے ہیں لیکن آپ کو ان پر کبھی تعجب نہیں ہوتا اور آپ کبھی والٹ وٹمین کی طرح راست گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ نہیں کہتے ''یا خدا!! یہ جانور کتنے خوش نصیب ہیں۔ ان میں سے کوئی بہکی بہکی باتیں نہیں کرتا، کوئی کسی کو بور نہیں کرتا اور کوئی کسی کو گمراہ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یا خدا! یہ جانور کتنے عقل مند ہیں''۔

☆☆☆

معلومات کا انسائیکلو پیڈیا

بیگم کہتی ہیں۔ آپ خوامخواہ منے کے ماموں کو کوستے ہیں، ہمارا اصرار ہے کہ منے کے ماموں کو نہ کوسا جائے۔ تو پھر کسے کوسا جائے، آپ ہی انصاف سے کہیے کہ ہم دونوں میں سے کون حق بجانب ہے۔ ہمارا تو سو فیصد خیال ہے کہ اس مصیبت کی تمام تر ذمہ داری منے کے ماموں پر عائد ہوتی ہے۔ نہ وہ منے کو اس کی سال گرہ پر ''معلومات کا انسائیکلو پیڈیا'' تحفے میں دیتے، نہ منا اسے پڑھنے کے بعد ہم سے طرح طرح کے سوال کر کے ہمیں جاہل ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ منا ٹھہرا ایک دم کتابی کیڑا۔ اس نے صرف تین چار دنوں میں ''معلومات کا انسائیکلو پیڈیا'' ختم کر ڈالی۔ اس پر ستم یہ کہ وہ جو پڑھتا ہے اسے جھٹ یاد ہو جاتا ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد اس کے سر میں یہ سودا سمایا کہ اپنے بڑوں کا امتحان لیا جائے یعنی اس بات کی تحقیق کی جائے کہ یہ بزرگ قسم کے لوگ جو اپنے کو عالم فاضل سمجھتے ہیں، دراصل کتنے پانی

میں ہیں۔ ہم اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد منا نے سوال کیا۔

''ڈیڈی۔ بھلا پنسلین کس نے ایجاد کی تھی''۔

ہم گھبرا سے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ بارہا ہم نے پنسلین کے ٹیکے لگواتے وقت ڈاکٹر کے علاوہ پنسلین کے موجد کو بھی دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہے، لیکن اس بات کا سراغ لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ بھلا مانس تھا کون، جس نے اسے ایجاد کیا کہ امرت دھارا کی طرح ہر مرض کا واحد علاج ہے۔ لیکن ہمیں منے کے سوال کا کچھ تو جواب دینا تھا کیوں کہ ہم نے خود ہی اسے کئی بار نصیحت کی تھی ''بیٹا زیادہ سے زیادہ سوالات پوچھا کرو، اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے''۔ ہم نے ایک آدھ منٹ سوچنے کے بعد کہا ''پنسلین ڈاکٹر الہ دین کی ایجاد ہے''۔

منے نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''واہ ڈیڈی۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ جناب پنسلین کا موجد سرالیگزینڈر فلیمنگ ہے''۔

ہم خفیف سے ہو گئے۔ اتنے میں منے نے دوسرا سوال داغ دیا ''اچھا بھلا بتائیے کہ دھنک میں سات رنگ کیوں ہوتے ہیں''۔

''اس لیے کہ وہ خوبصورت لگے''۔

''سات رنگ ہی کیوں، چودہ یا اکیس کیوں نہیں''۔

''شاید اس لیے کہ قدرت اتنی فضول خرچ نہیں''۔

''اچھا تو یہ سات رنگ کیسے بنتے ہیں''۔

''بیٹا یہ سب خدا کی باتیں ہیں۔ انہیں خدا ہی جانتا ہے''۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نہیں جانتے۔ اچھا میں بتاؤں''۔

''ہاں بتاؤ''۔

''دیکھیے بارش ہو چکنے کے بعد پانی کے کچھ قطرے ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ جب ان میں سے سورج کی سفید کرنیں گزرتی ہیں تو وہ سات رنگوں میں بٹ جاتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو دیکھیے۔

''معلومات کا انسائیکلو پیڈیا صفحہ 25''۔

''اگر اس میں ایسا لکھا ہے تو ایسا ہی ہوگا''۔

''اچھا بھلا بتائیے ''ٹنگ سٹین'' کیا ہوتی ہے؟''۔

''ہمارے خیال میں کسی چینی شاعرہ کا نام ہے''۔

''بالکل غلط''۔

''تو پھر کوئی جھیل ہوگی''۔

''یہ بھی غلط''۔

''تو پھر شاید وزن تولنے والی مشین کو کہتے ہوں گے''۔

''سر بسر غلط''۔

''معلوم نہیں کیا بلا ہوتی ہے''۔

''تعجب، آپ کو اتنا بھی پتا نہیں ''ٹنگ سٹین'' اس دھات کو کہتے ہیں جو بجلی کے بلب میں ہوتی ہے اور جو گرم ہونے کے بعد روشنی دینے لگتی ہے''۔

''اچھا منا تم اب باہر جا کر کھیلو، ہمیں اخبار پڑھنے دو''۔

''صرف ایک سوال اور...... اچھا یہ بتائیے کہ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ کون سے ہے اور اس کا رقبہ کتنا ہے؟''

''ہمارے خیال میں لنکا یا سارڈینیا''۔

''حسب معمول غلط''۔

''اچھا تم بتاؤ''۔

''گرین لینڈ۔ رقبہ 840000 مربع میل۔ حوالہ کے لیے دیکھئے ''معلومات کا انسائیکلو پیڈیا صفحہ 15''۔

منا فتح یابی کے ڈنکے بجاتا ہوا باہر چلا گیا۔ ہم سوچنے لگے آج ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ چاروں سوالوں میں سے ایک کا بھی صحیح جواب نہ دے سکے۔ چند دنوں کے بعد ہم دوستوں کو برسبیل تذکرہ بتا رہے تھے کہ نپولین نے ایک بار کہا تھا ''واٹرلو کی جنگ آئین کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی''۔ بدقسمتی سے منے نے ہماری بات سن لی اور فوراً اس کی تردید کرنے کے لیے کمرے میں آ دھمکا ''معاف کیجئے، ڈیڈی یہ قول نپولین کا نہیں اس کے فاتح ڈیوک آف ولنگڈن کا ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھئے ''معلومات کا انسائیکلو پیڈیا'' صفحہ 24''۔

ہمارے دوستوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور ہم پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چند اور

دنوں کے بعد ہمیں منے کے ہیڈ ماسٹر کی طرف سے ایک خط ملا لکھا تھا۔

''جناب من!

آپ کے منے نے دن رات اپنے اسکول ماسٹروں سے عجیب وغریب سوالات پوچھ پوچھ کر ان کا دم ناک میں کر دیا ہے۔ان میں سے دو ایک نے تو دھمکی دی ہے کہ اگر منے کو نہ روکا گیا تو ملازمت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ براہ کرم منے کو سمجھائیے کہ وہ اپنے استادوں پر رحم کرے''۔

ہم نے منے کو بلا کر پوچھ گچھ کی تو اس نے صفائی میں کہا ''ڈیڈی ہمارے ماسٹروں کو تو کچھ بھی نہیں آتا۔وہ بے چارے تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہیلیم (Helium) کس لیے استعمال کی جاتی ہے اور سٹیتھوسکوپ کس نے ایجاد کی تھی''۔

''یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں'' ہم نے کہا۔

''واہ! آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔ساری دنیا جانتی ہے کہ ہیلیم ایک ہلکی سی گیس ہے جسے مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور سٹیتھوسکوپ، رینی تھیوفائل لینک نے ایجاد کی تھی''۔

''بہر حال تمہیں ایسے سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں''۔

''ضرورت کیوں نہیں۔ جب ماسٹر صاحبان کو ہمارا امتحان لینے کا حق ہے تو ہمیں بھی ان کا امتحان لینے کا حق ہونا چاہئے''۔

بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ ماسٹر صاحبان ایسی باتیں پسند نہیں کرتے۔آئندہ تم جو سوال بھی چاہو، ہم سے پوچھ سکتے ہو، کہنے کو تو ہم نے کہہ دیا،لیکن اچھی خاصی مصیبت مول لے لی۔اب منا ہر روز ہم پر جرح کرنے لگا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، ایسے کیوں نہیں ہوتا،فلاں ملک کا رقبہ کتنا ہے، چاند زمین سے کتنی دور ہے، چاند گرہن کیوں لگتا ہے وغیرہ وغیرہ۔شروع میں ہم نے اس کے سوالوں کے غلط سلط جوابات دینے کی کوشش کی لیکن جب اس نے ہر جواب کا مذاق اڑایا تو ہم نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا، مثال کے طور پر منے نے پوچھا۔

''دنیا کی کل آبادی کتنی ہے؟''۔

''ہمیں معلوم نہیں، کوئی اور سوال پوچھو''۔

''دنیا کی سب سے بڑی جھیل کا نام کیا ہے؟''۔

''خدا جانے کیا ہے، کوئی اور سوال کرو''۔

''عمر خیام، ارسطو سے کتنے سال بعد پیدا ہوا تھا؟''

''معلوم نہیں۔ اگلا سوال پوچھو''۔

''قطب الدین ایبک کو ایبک کیوں کہتے ہیں''۔

''یہ بھی معلوم نہیں، کوئی اور سوال پوچھو''۔

''باٹی سیلی کون تھا؟''۔

''کوئی ہوگا۔ اس سے اگلا سوال پوچھو''۔

''پولینڈ کا دارالخلافہ بتائیے''۔

''پولینڈ کا دارالخلافہ...... ہے...... وہ...... یعنی اچھا اب جاؤ پڑھو لکھو۔ باقی کل پوچھ لینا''۔

ہم نے سمجھا کہ یہ چال چل کر ہم نے منے کو لاجواب کر دیا ہے لیکن ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، جب ہم نے منے کو ایک دن اپنے دوستوں سے یہ کہتے ہوئے سنا ''صاحب عجیب مصیبت ہے۔ کوئی کرے تو کیا کرے۔ علمیت کا تو گویا جنازہ ہے نکل گیا ہے۔ والدین تو جاہل اور ماسٹر صاحبان جاہل تر۔ اب کوئی کس سے تعلیم حاصل کرے پڑھانے والے ہی لد گئے!''

☆☆☆

ایک پہیلی

جب آپ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو سامنے کی دیوار پر ایک تصویر نظر آتی ہے، یہ ایک الو کی تصویر ہے۔ اسے غور سے دیکھ لیجئے اور ساتھ ہی یاد رکھئے کہ میرے کمرے میں اس کے سوا کوئی اور تصویر نہیں۔ یہ تصویر میرے دوستوں کے لیے ایک پہیلی بنی ہوئی ہے۔ جب میرا کوئی دوست پہلی بار مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے آتا ہے تو دو ایک منٹ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد پکار اٹھتا ہے ''ارے بھئی رشید! یہ کیا مذاق ہے!''

''مذاق نہیں صاحب! یہ الو ہے''۔ میں بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا ہوں۔

''الو! یہ الو تو بڑا منحوس پرندہ ہے۔ الو کی تصویر آپ نے......''۔

''دیکھئے صاحب! سب الو منحوس نہیں ہوتے، خاص کر یہ الو تو بالکل نہیں۔ جب سے میں

نے اس کی تصویر یہاں لٹکائی ہے، مجھے زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی نصیب ہوئی ہے''۔

اچھا تو گویا یہ تصویر ایک قسم کا جادو یا ٹونا ہے''۔

کچھ بھی سمجھ لیجئے۔ مجھے حساب کے مضمون میں ہمیشہ انڈا ملا کرتا تھا۔ جب سے یہ الو میرے کمرے میں آیا ہے، میں حساب میں اول رہا کرتا ہوں''۔

''واقعی؟ تب تو اس تصویر کی قدر کرنی چاہیے''۔

''جی ہاں۔ کافی قدر کر رہا ہوں، ہر روز صبح اٹھ کر اسے بڑے ادب سے سلام کرتا ہوں''۔

''الو کو سلام کرتے ہو! بڑی عجیب بات ہے''۔

''ذرا بھر عجیب نہیں۔ زندگی میں جن لوگوں کو اکثر سلام کیا جاتا ہے، وہ بھی یہی کچھ ہوتے ہیں''۔

''بہر حال جی نہیں مانتا کہ الو کو سلام کیا جائے''۔

''تو نہ کیا کیجئے۔ سلام کی بجائے گڈ مارننگ کہہ لیا کیجئے''۔

''ہر ایک دوست کو میں اس الو کے متعلق ایک نئی کہانی ایجاد کر کے سناتا ہوں اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ سچ ہے یا جھوٹ۔ ایک دوست کے اصرار کرنے پر کہ میں نے یہ تصویر کیوں لگا رکھی ہے، میں نے اسے بتایا'' آپ شاید جانتے ہوں گے کہ گاندھی جی اپنے پاس لکڑی کے تین بندر رکھا کرتے تھے۔ وہ ان کو اپنا گورو مانتے تھے۔ ان میں سے ایک بندر کا ارشاد تھا۔ کوئی بری بات مت سنو، دوسرے کا کہنا تھا، کوئی بری بات مت کہو اور تیسرے کی ہدایت تھی کوئی بری بات مت دیکھو''۔

''میں نے تین بندروں کی بجائے اس الو کو اپنا گورو بنا رکھا ہے''۔

''اچھا اس الو کی صرف تین ہدایتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ الو مت بنو، نہیں تو لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ دوسری کسی کو الو مت کہو نہیں تو جھگڑا ہو جائے گا۔ اور تیسری ہمیشہ اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کیا کرو۔ کیونکہ اس میں فائدہ رہتا ہے''۔

''بہت خوب! تب تو یہ الو بڑے کام کا ہے''۔

''جی ہاں۔ نہیں تو مجھے کیا پڑی تھی کہ بلبل یا کوئل کی بجائے الو کی تصویر لٹکاتا''۔

''ایک بار میں نے اس تصویر کے لیے یہ کہانی ایجاد کی۔ ہمارے خاندان میں ایک بزرگ بڑے مشہور فنکار ہوئے ہیں۔ یہ ان کا شاہکار ہے''۔

''تعجب! آپ کے بزرگ نے اپنے قلم کا زور الو بنانے پر صرف کیا''۔

''جی ہاں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں بیشتر لوگ الو ہوتے ہیں، کہتے ہیں جب کوئی آدمی ان سے تصویر کھینچنے کی فرمائش کیا کرتا۔ وہ الو کی تصویر بنا کر اس سے کہتے ''لیجئے تصویر حاضر ہے''۔

''بڑے زندہ دل تھے آپ کے بزرگ!''

''اس میں کیا شک ہے۔ یہ تصویر ہ جوان کا شاہکار ہے، دراصل ایک کروڑ پتی کی ہے، اس کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ لیکن عقل بالکل نہیں تھی''۔

''تو کیا اس کروڑ پتی نے یہ تصویر قبول کر لی''۔

''جی نہیں، اگر قبول کر لیتا تو پھر یہ یہاں کیسے ہوتی۔ اس نے تو ہمارے بزرگ پر مقدمہ چلانے کی دھمکی دی''۔

''تو پھر آپ نے بزرگ نے کیا کہا''۔

انہوں نے فرمایا ''بڑی خوشی ہے مقدمہ دائر کر دیجئے۔ ہر ایک سمجھ دار عدالت مجھ سے اتفاق کرے گی کہ میں نے آپ کی صحیح ترین تصویر بنائی ہے''۔

''چند دوستوں کی خدمت میں یہ دلیل پیش کرتا ہوں۔ ''دیکھئے جناب یہ تصویر آپ کے لیے نہیں نئے آنے والوں کے لیے ہے''۔

''وہ کیسے''۔

''جب کوئی پہلی مرتبہ اس کمرے میں آتا ہے تو علیک سلیک کے بعد اسے کوئی موضوع بات کرنے کے لیے نہیں سوجھتا۔ اس وقت یہ تصویر اس کے آڑے آتی ہے''۔

''لیکن کس طرح؟''

''وہ اس طرح کہ وہ تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا ہے'' یہ...... یہ کس کی تصویر ہے''۔

اور میں مسکرا کر جواب دیتا ہوں ''یہ میری تصویر ہے''۔

''آپ کی نہیں نہیں۔ یہ تصویر آپ کی نہیں ہو سکتی''۔

''اگر میری نہیں تو پھر آپ کی ہوگی''۔

''وہ گھبرا سا جاتا ہے اور کہتا ہے۔ یہ تو الو کی تصویر ہے''۔

''میرا بھی یہی خیال ہے''۔

’’یہ آپ نے کیوں لگا رکھی ہے‘‘۔

’’تا کہ اس کے متعلق بات چیت کی جا سکے‘‘۔

’’لیکن آپ کسی بہتر پرندے کی تصویر بھی تو لگا سکتے تھے‘‘۔

’’میرے خیال میں الو سے بہتر کوئی پرندہ نہیں‘‘۔

’’یہ آپ کیا فرما رہے ہیں‘‘۔

’’بالکل ٹھیک عرض کر رہا ہوں۔ دیکھئے جب کبھی آپ کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں جو آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھی، تو بے چارے الو کو کوسا جاتا ہے‘‘۔

’’کیسے؟‘‘

’’لوگ آپ سے کہتے ہیں الو کہیں کا۔ حالانکہ اس میں الو کا بالکل قصور نہیں ہوتا‘‘۔

’’آنے والا خاموش ہو جاتا ہے، بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ یا ہڑ بڑا کر کہتا ہے ’’اچھا مجھے اب رخصت ہونے کی اجازت دیجئے‘‘۔

چنانچہ میں نے اس الو کے متعلق حکائتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ جب میرے دوست میری غیر حاضری میں کسی جگہ اکٹھا ہوتے ہیں اور اس الو کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو وہ آپس میں جھگڑتے ہیں۔ ایک کہتا ہے ’’لیکن مجھے تو رشید نے بتایا تھا کہ یہ تصویر انہیں ایک الو کے گھونسلے سے ملی تھی‘‘۔ دوسرا اس کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔ ’’بالکل غلط یہ تصویر تو رشید کے ڈرائنگ ماسٹر کی پہلی تخلیق ہے، وہ طوطا بنانا چاہتے تھے، طوطا تو بن نہ سکا، اس کی بجائے الو بنا ڈالا‘‘۔ تیسرا بول اٹھتا ہے۔ ’’مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ یہ الو ہرگز نہیں یہ آسٹریلیا کا ایک بڑا پیارا پرندہ ہے۔ جس کا نام ہے ’’آسٹر کاسٹر زلو‘‘

الغرض میرے تمام احباب اس راز کو کھولنے کے لیے گھنٹوں سر پٹکتے ہیں لیکن پھر بھی اس معمے کو حل نہیں کر پاتے کہ میں نے یہ تصویر کیوں لٹکا رکھی ہے۔

اب آپ سے کیا پردہ! دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ایک کباڑی کو دس روپے ادھار دیئے تھے۔ متواتر دس مہینے تقاضا کرنے کے باوجود جب میں اس سے یہ رقم حاصل نہ کر سکا تو ایک دن تنگ آ کر میں اس کی دکان سے یہ الو کی تصویر اٹھا لایا۔ یہ تصویر میں نے اس لیے لٹکا رکھی ہے کہ مجھے اس بات کی یاددہانی کراتی رہے کہ کس شخص کو قرض نہیں دینا چاہیے۔ اگر دو گے تو خوامخواہ الو بنو گے!‘‘

☆☆☆

پانچ قسم کے بے ہودہ خاوند

اگر کسی مرد سے پوچھا جائے پانچ قسم کے بے ہودہ خاوند کون سے ہوتے ہیں تو وہ کہے گا ''صاحب! عقل کے ناخن لیجئے۔ بھلا خاوند بھی کبھی بے ہودہ ہوئے ہیں۔ بے ہودگی کی سعادت تو صرف بیویوں کے حصے میں آئی ہے''۔ اور اگر کسی عورت سے یہی سوال کیا جائے تو جواب ملے گا ''صرف پانچ ہی کیوں پانچ ہزار قسم کے بے ہودہ خاوند کیوں نہیں''۔

اس لیے بہتر ہوگا یہ سوال کسی سے نہ کیا جائے، بلکہ کسی حیل وحجت کے بغیر فرض کرلیا جائے کہ پانچ قسم کے بے ہودہ خاوند ہوتے ہیں اور ہندوستان کی ہر ریاست میں پائے جاتے ہیں۔

بے ہودہ خاوندوں کی پہلی جماعت ان افراد پر مشتمل ہے جو اپنے کو خاوند کم اور نادر شاہ درانی زیادہ سمجھتے ہیں۔ بیوی کے حقوق اور احساسات کو بے دردی سے تہہ تیغ کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ انہی کے بارے میں ایک شاعرہ نے (نادر شاہ درانی سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے) کہا ہے۔

وہ قتل عام کرتا تھا یہ قتل خاص کرتے ہیں
وہ دنیا کو ڈراتا تھا، یہ بیوی کو ڈراتی ہیں

ان کا باوا آدم وہ خاوند تھا جس نے بیوی پر رعب جمانے کے لیے اپنی پالتو بلی کو ذبح کر ڈالا تھا اور جس نے ''گربہ کشتن روز اول'' ایسے مضحکہ خیز مقولے کو ایجاد کیا تھا۔ میری دانست میں وہ بیوی جو ایسے خاوند سے مرعوب ہوگئی تھی، ضرورت سے زیادہ بزدل تھی۔ شاید اسے اختلاج قلب کے دورے پڑتے تھے ورنہ اگر آپ اتنے ہی بہادر ہیں تو اسی خنجر سے جس سے آپ نے بلی کی گردن اڑادی۔ شیر کا سر کاٹ لائیے اور ''شیر افگن'' کا خطاب پائیے!''

دوسری قسم کے بے ہودہ خاوند وہ ہیں جو بیوی کو جسمانی لحاظ سے کمزور اور ذہنی اعتبار سے ناقص العقل سمجھتے ہیں۔ انہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ موجودہ سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ ''صنف نازک'' عورت نہیں مرد ہے۔ مثال کے طور پر عموماً مردوں کی عمر عورتوں سے کم ہوتی ہے۔ بہت کم عورتیں گنجی ہوتی ہیں یا کم از کم ان کے سر اس حد تک گنجے نہیں ہوتے جتنے مردوں کے ہوتے ہیں۔ پاگل خانے مردوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہی حال جیل خانوں کا بھی ہے۔ مردوں کی نسبت عورتیں سردی اور گرمی زیادہ برداشت کرسکتی ہیں۔ ان کا اعصابی نظام اس قدر

پائیدار ہوتا ہے کہ ساس، جیٹھانی اور خاوند کی جلی کٹی سننے کے باوجود ان کا دماغی توازن برقرار رہتا ہے۔ انہیں آئے دن زہر کا پیالہ دینے کے بعد تاکید کی جاتی ہے کہ اسے پینا ہوگا۔ بھگوان شنکر کی طرح وہ زہر بھی بخوشی حلق سے اتار لیتی ہیں اور پھر بھی زندہ رہتی ہیں۔ جتنا ایک ہندستانی بیوی کو سننا یا سہنا پڑتا ہے، خاوندوں کو اس سے بھی نصف سننا یا سہنا پڑے تو ان میں سے پچاس فیصد اپنا دماغی توازن ہی کھو بیٹھیں۔

اب رہی عورتوں کی ناقص العقل ہونے کی بات تو آپ ہی انصاف سے کہیے مردوں سے آج تک کون سا مسئلہ حل ہوا ہے جو انہیں اپنی عقل و دانش پر اتنا ناز ہے۔ کیا جنگ، ہتھیار بندی یا عالمی اخوت کے مسائل صدیوں کی چنا چنی کے باوجود وہیں نہیں ہیں جہاں وہ ابتدائے آفرینش سے تھے اور کیا مرد پر اکبرالہ آبادی کے فلسفے کی طرح یہ مصرعہ صادق نہیں آتا۔ ڈور کو الجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں!

بے ہودہ خاوندوں کی تیسری جماعت میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنی بیویوں کا اپنے ہمسایوں کی بیویوں سے موازنہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی بیویاں اول درجہ کی پھوہڑ اور جاہل واقع ہوئی ہیں اور اگر وہ بطور کلرک یا معلم ذلیل و خوار ہو رہے ہیں تو اس مصیبت کی تمام تر ذمہ داری ان کی بیویوں پر عائدہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت کو سراسر فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر وہ زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں تو اس کی وجہ ان کی سست روی، کم ہمتی یا نالائقی بھی ہو سکتی ہے اور بیویوں کو کوس کر وہ اپنی ناکامی کا ایک ایسا جواز ڈھونڈ رہے ہیں جس پر ان کے سوا کوئی اور شخص یقین نہیں کر سکتا۔ ایسے خاوند بھلی چنگی بیویوں کے اس لیے درپے آزار رہتے ہیں تاکہ وہ احساس خفت سے اپنی گلو خلاصی کرا سکیں۔ وہ اپنی بڑی سے بڑی کمزوری کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن بیویوں کی معمولی سے معمولی لغزش کو معاف نہیں کرتے۔ یعنی انہیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ لیکن بیوی کی آنکھ کا تنکا بھی کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

بے ہودہ خاوندوں کی چوتھی صف میں وہ لوگ آتے ہیں جنہیں بیوی کے رشتے داروں سے خداواسطے ابیر ہوتا ہے۔ یہ کم ظرف سے کم ظرف دوست کی خاطر و مدارات کر سکتے ہیں لیکن

سسرالی رشتے دار جب ان کے یہاں آتے ہیں تو ان کا خون خشک ہو جاتا ہے، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ یہ اپنے ہر فعل سے سسرالی مہمان کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ یگانہ نہیں بے گانہ ہے۔ مثلاً جب یہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے پوچھتے ہیں۔ ''آپ کب تشریف لائے!'' یا ''آپ کب تشریف لے جا رہے ہیں؟'' جونہی مہمان ان کے گھر میں قدم رکھتا ہے، انہیں جھٹ کوئی ضروری کام یاد آ جاتا ہے اور جب کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹتے ہیں تو اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہیں کہ مہمان سے بات تک نہیں کر سکتے۔ اگر بیوی شکایت کرتی ہے کہ وہ مہمان کے ساتھ بڑی بے رخی سے پیش آ رہے ہیں تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ''تم بھی عجیب عورت ہو، تمہارے رشتہ داروں سے چاہے کتنا ہی اچھا سلوک کروں۔ تمہاری تسلی نہیں ہوتی۔ تم تو چاہتی ہو تمہارے معمولی سے معمولی رشتہ داروں کو بھی سر آنکھوں پر بٹھایا جائے۔ مگر وہ اس قابل بھی تو ہوں۔ اونہہ بڑے آئے رئیس کہیں کے۔ بات کرنے کی تو تمیز نہیں اور پھر عادتیں اتنی مکروہ کہ خدا کی پناہ! کل تمہارے ماموں کا داماد میرے ٹوتھ برش سے دانت صاف کر رہا تھا۔ لاحول ولاقوۃ! بد مذاقی کی حد ہو گئی۔ لعنت بھیجو ایسے رشتہ داروں پر''۔

بے ہودہ خاوندوں کی پانچویں جماعت میں ان لوگوں کا شمار کیا جا سکتا ہے جو اس مختصر سے مضمون کو پڑھ کر بیخ پا ہوں گے یا جن کا ردعمل یہ ہوگا ''یہ مضمون ضرور کسی زن مرید خاوند نے لکھا ہے یا شاید وہ بیویوں کا ایجنٹ ہے، کم بخت کو خاوندوں پر اتنے سنگین الزام تراشتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ خاوند ہونے کے باوجود خاوندوں کی ناک کٹوا دی''۔ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے۔ آج جب کہ وطن میں قریب قریب ہر ایک ستون (مذہب، سیاست، تہذیب) گر چکا ہے، سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا، صرف ایک ستون کے سہارے کھڑا ہوا ہے اور وہ ستون ہے ہندوستانی بیوی۔ آج بھی اگر خود غرضی کی تیز و تند آندھی میں ایک چراغ جل رہا ہے تو وہ ہے آپ کی بیوی۔ اس لیے اگر مضمون نگار نے خاوندوں کی بجائے بیویوں کی طرف داری کی ہے تو اس نے کسی قسم کی بے ہودگی کا ارتکاب نہیں کیا۔

☆☆☆

ایک عبرتناک داستاں

اگر مہاراجہ تنکلی پرشاد نے رشوت کو قانوناً جائز قرار دیا تھا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ خود رشوت خور تھے یا رشوت خوری کو گناہ کی بجائے ثواب سمجھتے تھے۔ دراصل یہ حکم انہوں نے آخری حربے کی طور پر جاری کیا تھا، کیونکہ ان کے خیال میں اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ دس سال پہلے انہوں نے لوگوں کو وید، قرآن انجیل اور گرنتھ صاحب کا واسطہ دے کر سمجھایا تھا کہ رشوت دینا اور لینا گناہ عظیم ہے لیکن ان کی رعیت نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ہم الہامی کتابوں کے باقی کون سے احکام کی پرواہ کرتے ہیں جو اس ارشاد کو تسلیم کریں۔ پانچ سال پہلے انہوں نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ رشوت لینے اور دینے والے والے کو گولی سے اڑا دیا جائے گا لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب پانچ سال کے عرصہ میں کوئی شخص رشوت دیتے یا لیتے پکڑا نہیں گیا۔ وجہ؟ وجہ یہ کہ پکڑنے والے خود رشوت خور تھے۔ تنگ آ کر مہاراجہ تنکلی پرشاد نے اپنی رعایا کو رشوت لینے اور دینے کی کھلی چھٹی دی دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کبھی کبھی بقول غالب جب درد حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا ہو جاتا ہے۔

مہاراجہ کے اس اعلان پر ''ذلت نگر'' میں چراغاں کیا گیا۔ ہر ایک شہری نے بغلیں بجا کر اپنے ہمسائے سے کہا۔ ''آخر خدا نے ہماری سن لی، اب زندگی کا مزا آئے گا۔ بھلا رشوت خوری کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ چنانچہ رشوت کا وہ بازار گرم ہوا کہ تمام ریکارڈ مات پڑ گئے۔ مہاراجہ کو ہر روز رشوت ستانی سے متعلق رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں وصول ہوتیں، لیکن انہیں رتی بھر اشتعال نہ آتا۔ وہ کہتے ''جب لوگ اس دستور کو پسند کرتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے''۔

رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ ''ذلت نگر'' میں کوئی کام رشوت دیئے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہر دفتر کے دروازے پر سائن بورڈ لگا دیا گیا جس پر جلی حروف میں لکھا گیا ''اگر آپ رشوت کے بغیر کام نکالنا چاہتے ہیں تو آپ مسخرے ہیں یا سر پھرے''...... خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، اس لیے رشوت ستانی ان محکموں میں بھی سرایت کرنے لگی جو اس سے مبرا تھے۔

مثال کے طور پر جب لالہ غریب داس اپنے لڑکے کو کالج میں داخل کرنے گئے تو پرنسپل

صاحب نے ان سے فرمایا ''جی ہاں ہم آپ کے لڑکے کو داخل کر لیں گے لیکن پہلے معاملہ طے کر لیجیے ۔'' اجی معاملے کی کیا بات ہے، بڑا لائق لڑکا ہے، یونیورسٹی میں دوم آیا ہے، شروع سے وظیفہ خوار رہا ہے''۔
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارے نذرانے کی متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟''
''نذرانہ! تو گویا آپ بھی نذرانہ طلب کرتے ہیں؟''
''کیوں نہیں صاحب، جب باقی محکموں میں اس کا رواج ہے تو محکمہ تعلیم نے کیا گناہ کیا ہے؟''
''آپ بجا فرماتے ہیں لیکن بندہ بہت غریب ہے''۔
''آپ شاید نہیں جانتے کہ ذلت نگر میں غربا کے لیے کوئی جگہ نہیں''۔
''لیکن جناب میرا لڑکا بہت ذہین ہے۔ آپ کے کالج کا نام روشن کرے گا''۔
''ہمیں کالج کے نام کی اتنی فکر نہیں جتنی نذرانہ کی ہے...... کہیے پانچ سو روپے دیں گے آپ؟''
''پانچ سو! جناب میرے پاس تو فیس ادا کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں۔ میں تو فیس میں بھی رعایت کا طالب ہوں''۔
''اچھا ہم آدھی فیس معاف کر دیں گے لیکن اس کے لیے آپ کو الگ نذرانہ ادا کرنا ہوگا''۔
''جناب میں سچ کہتا ہوں۔ میری مالی حالت بہت خستہ ہے، نذرانہ ادا کرنے کے ہرگز قابل......''۔
''آپ خوامخواہ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ایسے ہی مفت خور تھے تو یہاں آئے کیوں''۔

☆☆☆

تار گھر کے ایک چپراسی رام گوپال نے شری کیول کرن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب آپ کا تار آیا ہے''۔
''تو لائیے''۔
''واہ صاحب، ایسے ہی اپ کے حوالے کر دیں۔ آخر تار ہے کوئی معمولی خط تو نہیں''۔
''لیکن تار پہنچانا تو تمہارا فرض ہے''۔
''آج کل اپنا فرض کون ادا کر رہا ہے، جو ہم کریں''۔
''اچھا تار لائیے۔ اگر کوئی خوشخبری ہوئی تو منہ میٹھا کرائیں گے''۔

’’تو گویا آپ سستے چھوٹنا چاہتے ہیں اور اگر خدانخواستہ بری خبر ہوئی ؟‘‘

’’تو پھر تو مجبوری ہے‘‘۔

’’معاف کیجئے ،ہمیں یہ سودا پسند نہیں‘‘۔

’’تو تم چاہتے کیا ہو؟‘‘۔

’’ہم وہی چاہتے ہیں جو’’ ذلت نگر‘‘ میں ہر شخص چاہتا ہے یعنی نذرانہ !‘‘

’’تو اگر نذرانہ پیش نہ کیا جائے تو؟‘‘۔

’’تو یہ تار آپ کو حشر تک نہ ملے گا!‘‘۔

☆☆☆

ایک ٹکٹ بابو نے ٹکٹ دینے سے پہلے نذرانے کا مطالبہ کیا اور جب تک اسے معقول رقم پیش نہیں کی گئی اس نے ٹکٹ نہیں دیا۔ اسے لاکھ سمجھایا گیا کہ وہ سرکاری نوکر ہے اور مسافروں کو ٹکٹ نہ دے کر اپنی فرض سے کوتاہی کر رہا ہے لیکن اس کے پاس پہلے سے جواب تیار تھا’’قبلہ سرکاری نوکر تو اور بھی بہتیرے ہیں، آپ ان سے جواب طلب کیوں نہیں کرتے‘‘۔

ایک انجن ڈرائیور نے جان بوجھ کر گاڑی روک لی اور اسے اس وقت تک روکے رکھا، جب تک مسافروں سے نذرانہ وصول نہ کرلیا۔

’’ایک راہ گیر نے ایک مریض کو اسپتال کا راستہ بتانے سے پہلے پانچ روپے بطور نذرانہ حاصل کیے۔ ایک شخص کو جب اسلام علیکم کہا گیا تو اس نے جواب میں وعلیکم السلام کہنے کے لیے دس روپے طلب کیے۔ ایک اور شخص سے جب پوچھا گیا’’ کہئے مزاج کیسا ہے؟‘‘ تو اس نے کہا ’’اگر آپ واقعی میرے مزاج کے متعلق پوچھنا چاہتے ہیں تو مبلغ پندرہ روپے نکالیے!‘‘

مہاراجہ تکلی پرشاد آئے دن رشوت ستانی کے عجیب وغریب قصے سنتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے کہ رشوت ستانی خوب رنگ لا رہی ہے۔ وہ رات کے وقت عموماً بھیس بدل کر اپنی رعیت کا حال معلوم کرنے کے لیے نکلا کرتے اور اس طرح کے دلچسپ مکالمے سن سن کر خوش ہوتے۔

’’کیوں صاحب۔ آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟‘‘۔

’’جناب پہلے نذرانہ پیش کیجئے پھر وقت بتائیں گے‘‘۔

’’آپ کھڑے کیوں ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جائیے‘‘۔

''لیکن کرسی پر بیٹھنے کا نذرانہ کیا ہوگا؟''۔

''وہ دیکھئے وہ رہا عید کا چاند؟''

''دیکھیں گے۔ پہلے آپ نذرانے کا فیصلہ کرلیں''۔

وقت گزرتا گیا اور مہاراجہ تکلی پرشاد ایسے مکالموں سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ انہیں ان پر نہ رونا آتا نہ غصہ۔ لیکن ایک رات انہوں نے ایک ایسا دل روز منظر دیکھا کہ وہ تھرا گئے۔ چودھویں کے چاند کی روشنی میں انہوں نے ایک عورت کو سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے پایا، اس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا، جو بلک بلک کر اپنی ماں کی چھاتی تک اپنا منہ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اسے بہت بھوک لگی ہے لیکن اس کی ماں اپنے ہاتھ سے اس کے منہ کو پرے ہٹاتے ہوئے کہہ رہی تھی ''برخوردار! اب محض رونے یا چیخنے سے دودھ نہیں ملے گا۔ پہلے نذرانہ نکالو!'' مہاراجہ تکلی پرشاد آخر انسان تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ششسدر رہ گئے اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلا ''یا خدا! اگر میری قوم اتنی ذلیل اور پست ہوگئی ہے تو بہتر ہے کہ اسے تو فوراً تہس نہس کردے!''

خدا جانے مہاراجہ نے یہ دعا کون سے مبارک لہجے میں مانگی تھی کہ قبول ہوگئی۔

کہتے ہیں کہ اس رات ایک خوفناک زلزلہ آیا اور آن کی آن میں ''ذلت نگر'' کا ذلیل شہر تباہ و برباد ہوگیا۔

☆☆☆

مرزا لطیفہ

ہم نے مرزا لطیفہ سے زیادہ سادہ مزاج شخص آج تک نہیں دیکھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ سادہ لوحوں کے بادشاہ ہیں تو رتی بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ جب اسکول میں پڑھتے تھے تو انہیں کسی دوست نے بتایا کہ دیئے کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو آنکھیں خراب نہیں ہوتیں۔ چنانچہ متواتر تین سال دیئے کی مدھم روشنی میں مطالعہ کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بینائی کمزور ہوگئی اور انہیں کتے پر بکری اور بکری پر بارہ سنگھے کا دھوکا ہونے لگا۔ آخر عینک لگوائی اور آئے دن کے مغالطوں سے ہمیشہ کے لیے نجات پائی۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کسی مسخرے نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر اخروٹ دانتوں سے توڑے جائیں تو دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ایک دن ایک سخت سا

اخروٹ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔اخروٹ تو ٹوٹا نہیں البتہ ان کے دو دانت ضرور ٹوٹ گئے۔جب کالج میں پہنچے تو انہوں نے ایک کتاب میں پڑھا، جو خواب آدھی رات کے بعد آتے ہیں، بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ایک رات انہوں نے خواب دیکھا کہ ان کے عزیز دوست میاں جگنو اللہ کو پیارے ہو گئے۔اسی وقت اٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، روتے تھے اور ہر دس منٹ بعد غالب کا شعر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ رقت آمیز لہجے میں پڑھتے تھے

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی جگنو
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

جب صبح ہوئی، اپنے ہم جماعتوں کو مرحوم کی باتیں سنا کر آٹھ آٹھ آنسو روئے۔اجی صاحب کیا بات تھی میاں جگنو کی۔کتنی چھوٹی سی پیاری پیاری ناک تھی۔اس پر مکھی تو کیا کھٹمل تک نہیں بیٹھنے دیتے تھے اور آنکھیں، آنکھیں اتنی خوبصورت تھیں کہ انہیں ایک بار دیکھنے کے بعد اپنی آنکھیں نوچ لینے کو جی چاہتا تھا۔وہ تو صاحب مہر و وفا کے پتلے تھے۔ایک بار میری عینک گم ہو گئی، انہوں نے مجھے اپنی عینک دیتے ہوئے کہا، اس کا نمبر آپ کی عینک سے دگنا ہے تاہم جب تک آپ کی عینک بن کر نہیں آتی اس سے کام چلایئے۔

حسن اتفاق سے اسی شام میاں جگنو آگرہ سے انہیں ملنے کے لیے آ گئے۔انہیں دیکھ کر مرزا لطیفہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔بار بار عینک سے گھور کر دیکھتے کہ یہ واقعی میاں جگنو ہیں یا ان کا بھوت ہے۔جب تین چار دفعہ ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ وہ گوشت پوست کے انسان ہیں تو گلے سے لگا کر بولے، جگنو بھائی خدا نے تمہیں دوبارہ زندگی بخشی۔اس خوشی میں تمہیں فلم ''آدگون'' دکھائی جائے گی۔

کالج چھوڑنے کے بعد جب مرزا ایک کمپنی میں کلرک ہوئے تو انہوں نے ایک دن کسی اخبار میں پڑھا کہ بیس جون کو دنیا ختم ہو جائے گی۔آپ اس بے بنیاد خبر پر ایمان لے آئے اور گھر کی تمام چیزیں اونے پونے بیچنے لگے۔ہم نے پوچھا ''آپ یہ کیوں کر رہے ہیں''۔آبدیدہ ہو کر فرمایا ''جب دنیا ہی ختم ہو رہی ہے، تو فرنیچر، کتابوں اور موتیوں کا کیا فائدہ۔جو تھوڑی بہت رقم مل جائے غنیمت ہے''، ہم نے جواب میں کہا ''جب دنیا ہی نہ رہی تو آپ رقم لے کر کیا کیجئے گا''۔کہنے لگے اس مسئلہ پر تو ہم نے ابھی غور نہیں کیا''۔

خیر اس قسم کے شگوفے تو مرزا آئے دن چھوڑتے رہتے ہیں۔ چند دن ہوئے ایک ایسا عجیب وغریب واقعہ ہوا کہ وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے۔ ہوا یہ کہ انہوں نے اپنا زائچہ جوتشی کو دکھایا۔ جوتشی نے بتایا کہ ان کے چوتھے گھر میں سنیچر ہے۔ مرزا نے حیران ہو کر کہا ''پنڈت جی۔ میرا تو صرف ایک گھر ہے اور دراصل وہ بھی میرا نہیں کرائے پر لے رکھا ہے۔ میرے چوتھے گھر میں سنیچر کیسے داخل ہو گیا''۔ پنڈت جی نے انہیں مطلع کیا کہ چوتھا گھر جوتش کی ایک اصطلاح ہے۔

''خیر ہو گی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے''۔

''فرق یہ پڑتا ہے کہ آپ جو بھی کام کریں گے، اس میں رخنہ پڑے گا''۔

''بخدا یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں۔ اب اس کو ہی لیجئے کہ میری سگائی خالہ زبیدہ کی لڑکی سے ہونے والی تھی۔ میں ان کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں چچی ہاجرہ مل گئیں۔ وہ مجھے اپنے گھر گھسیٹ کر لے گئیں اور زبردستی میرا نکاح اپنی لڑکی نگہت کے سات پڑھوا دیا اور سنئے جب مجھے سڑک کے پار جانا ہوتا ہے، بسوں یا موٹروں کا قافلہ میرے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات سڑک پار کئے بغیر گھر واپس آ جاتا ہوں''۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے''۔

''وہ کیسے؟''۔

''سنیچر کے دن کالے ناگ کو دودھ پلا دیجئے۔ سنیچر ٹل جائے گا''۔

مرزا لطیفہ نے جوتشی کی بات پلے باندھ لی۔ ایک تھرموس میں دودھ بھر کر کالے ناگ کی تلاش کرنے لگے۔ اگر اکیلے تلاش کرتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن وہ اصرار کرنے لگے کہ ہم بھی ان کے ساتھ چلیں کیونکہ دوست وہی ہوتا ہے جو مصیبت کے علاوہ کالے ناگ کی تلاش میں بھی دوست کا ساتھ دیتا ہے۔

ہم نے ان کی معیت میں جنگلوں، بیابانوں اور ان تمام جگہوں کی خاک چھانی جنہیں کالے ناگوں کا مسکن بتایا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ناگ تو کہاں چھپکلی تک نظر نہ آئی۔ ایک دن مرزا اداس ہو کر کہنے لگے۔ ''معلوم ہوتا ہے تمام کالے ناگ یہاں سے ہجرت کر گئے ہیں''۔

''ہم نے پوچھا کیوں اور کہاں؟''۔

''ممکن ہے وہ ایک جگہ رہتے رہتے اکتا گئے ہوں یا آب وہوا کی تبدیلی کے لیے افریقہ چلے گئے ہوں''۔ مرزا نے جواب دیا۔

''پھر تو ان کی تلاش بے سود ہے''۔

اب جب کبھی مرزا کو کسی معمولی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا اس کی ذمہ داری سنیچر کے سر تھوپ دیتے۔ ایک بار جب رقموں کی غلط میزان لگانے پر انہیں سخت سست کہا گیا تو فرمانے لگے۔ ''یہ سب سنیچر کا قصور ہے کہ ہر بار اٹھارہ جمع نوستائیس کی بجائے میں تینتالیس لکھتا رہا''۔

آخر جب مرزا کا وہم جنون کی حدود کو چھونے لگا تو ہم نے انہیں اس سے نجات دلانے کی ایک ترکیب سوچی۔ ایک سنیچر وار ہم ایک سپیرے کو جس کے پاس کالا ناگ تھا، مرزا کے گھر لے گئے۔ مرزا سے کہا گیا کہ تھرموس میں دودھ بھر کر ایک کرسی پر بیٹھ جائیں اور جونہی ناگ پھن پھیلا کر ان کے سامنے آئے، بڑی عقیدت سے اسے دودھ پیش کر دیں۔ سپیرے نے ناگ کو پٹاری میں سے نکال کر فرش پر رکھا اور بین بجانی شروع کی۔ ناگ نے یک لخت پھن ہوا میں لہرایا اور مرزا کی طرف لپکا۔ شاید اس نے اپنی زبان سے مرزا کے ہاتھ کو چھو بھی لیا۔ ایک دل روز چیخ مار کر مرزا کرسی سے نیچے گر پڑے اور اس عالم میں جا پہنچے جس کے متعلق کہا گیا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

انہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ ان کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ تین دن ٹمپریچر رہا۔ اکثر خواب میں چیختے ''ساڑ ڈالا ظالم نے بچاؤ بچاؤ''۔

جب چوتھے دن اسپتال سے گھر لوٹے تو انہوں نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ ''ناگ کو دودھ پلا دیا تھا نا''۔

ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا ''جی ہاں۔ معلوم ہوتا ہے بڑا لذیذ دودھ تھا ناگ غٹاغٹ پی گیا''۔

''اجی پیتا کیسے نہ، ڈیری کا خالص دودھ تھا'' مرزا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''چلیے سنیچر تو ٹل گیا''۔

''ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں''۔

''اور خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی''۔

''اونہہ'' مرزا لطیفہ نے منہ بنا کر کہا ''ایسی کون سی بات تھی یونہی ذرا چکر آ گیا تھا''۔

☆☆☆

تازہ تخلیق

مہمان نوازی کا تقاضا ہے کہ جب کوئی ادیب یا شاعر آپ کے ہاں تشریف لائے تو پان سگریٹ سے اس کی خاطر و تواضع کرنے کے بجائے اس سے بڑے ادب کے ساتھ درخواست کی جائے۔

''صاحب کوئی تازہ تخلیق سنائیے''۔

لیکن شاید بہت کم میزبان جانتے ہیں کہ اس قسم کی فرمائش کرنا آ بیل مجھے مار کے مصداق خود بخود مصیبت میں پھنسنا ہے۔ ایک دن ہماری شامت جو آئی، مرزا سنگدل سے یہی فرمائش کر بیٹھے۔ انہوں نے پان چباتے ہوئے پوچھا۔

''کونسی چیز سننا پسند کیجئے گا۔ غزل، نظم، گیت، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مرثیہ، فلمی گیت یا جدید نظم؟''

ہم نے عرض کیا۔

''کوئی جدید نظم ہی ہو جائے''۔

''بہتر! نظم سننے سے پہلے اس کی تمہید پر غور فرمائیے گا''۔

''ارشاد!''

ایک دن ہم جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ پت جھڑ کا موسم اور شام کا وقت تھا، یکلخت ہم نے ایک کیکر کے درخت پر ایک الو بیٹھا دیکھا۔ الو بولا۔

''ٹو ہو، ٹو ہو!''۔

ہم نے جواب میں کہا۔

''ہیلو مسٹر الو!''

الوشاید انگریزی میں سمجھتا تھا۔اس نے پھر وہی صدا لگائی۔

''ٹو ہو،ٹو ہو!''

ہم نے سمجھا کہ پوچھ رہا ہے۔''ہاؤ آر یو'' یعنی اپ کا کیا حال ہے!'' ہم نے اسے اپنے حال سے آگاہ کیا۔ وہ پھر چیخا ''ٹو ہو'' ٹو ہو۔ہم نے جھڑک کر کہا۔بہرے ہو۔سنا نہیں۔ ہمارا حال بہت اچھا ہے''۔الو نے ایک بات پھر نعرہ لگایا۔''ٹو ہو۔ٹو ہو'' ہم نے چلا کر اسے سرزنش کی۔

''بند کرو بکواس! ایک شاعر سے مذاق کرتے شرم نہیں آتی۔الو کہیں کا!''

''تمہید تو خوب ہے اب نظم بھی عنایت فرمائیے''۔

''ملاحظہ فرمائیے لکھا ہے''۔

''دور اک بستی سے دریا کے قریب

ایک جنگل،سونا،بے رواں،اداس

جیسے میری زندگی

سب شجر بے برگ و بار

جیسے میرا سر

جو کہ گنجا ہے انڈے کی طرح

اس میں اک کیکر کہ جیسے کوئی دق کا ہو مریض

اس پہ اک الو کہ جیسے کوئی عقل بے شعور

رٹ لگاتا ہے وہ ٹو ہو کی مگر

چاہتا ہے پوچھنا ہو آر یو؟

میں نے سوچا بستی میں اس سے بڑے الو بھی ہیں

کیوں نہ ان کے ساتھ یہ الو رہے''۔

''مرزا صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔جواب نہیں آپ کا واللہ!''

''آداب عرض! اچھا اب ایک گیت سنئے۔یہ میں نے بچوں کے لیے لکھا ہے دراصل ریڈیو والوں نے لکھوایا ہے۔عرض کیا ہے۔

ساون آیا کتے بھونکے
کتے بھونکے بلبل چہکا
بلبل چہکا شیر دھاڑا
شیر دھاڑا کوئل کوکی
کوئل کوکی بادل گرجے
بادل گرجے بچے چیخے
جوہڑ میں مینڈک ٹرائے
ساون آیا بادل چھائے

ہم نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''بڑا پیارا گیت ہے، ساون کی تصویر کھینچ کر رکھ دی''۔

''شکریہ! لیجئے۔ لگے ہاتھوں اب ایک تازہ فلمی گیت بھی سن لیجئے''۔

پیار میں ہم نے کوڑے کھائے پھر بھی باز نے آئے
جب ہم خود ہی پاگل ہوں تو کون ہمیں سمجھائے
ہائے رے ہائے۔ ہائے رہے ہائے
دور سے ہم کو دیکھ کر سجنی جب دیدے مٹکائے
شرم سے ہم ہوں پانی پانی اس کو شرم نہ آئے
ہائے رے ہائے۔ ہائے رہے ہائے

ہم نے گیت کی رسمی طور پر تعریف کرتے ہوئے کہا ''بہت دلچسپ گیت ہے''۔

''اجی حضرت یہ تو صرف پہلا بند ہے مکمل گیت سن لیجئے۔ تعریف بعد میں کر لیجئے گا''۔

''معاف کیجئے مرزا صاحب۔ مکمل گیت پھر کبھی سنیں گے۔ اس وقت ایک نہایت ضروری کام یاد آ گیا''۔

مرزا صاحب بادل ناخواستہ تشریف لے گئے اور وہ جو ضروری کام ہمیں یاد آ گیا یہ تھا کہ ان کی تازہ تخلیقات سن کر جو طبیعت بدمزہ ہوئی تھی، اسے بحال کرنے کے لیے غالب کی کسی غزل کو چالیسویں بار پڑھا جائے۔

ابھی دیوان غالب تلاش کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مس مقراض تشریف لائی ہیں۔ آپ افسانہ نویس ہیں۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے بعد بدقسمتی سے ہمارے منہ سے نکل گیا۔

''کوئی تازہ تخلیق سنائیے''۔

''تازہ تخلیق؟ اچھا تو ہمارا نیا افسانہ سنئے''۔

''سنائیے''۔

''افسانے کا عنوان ہے، سانجھ کا تارا''۔

''بڑا شاعرانہ نام ہے''۔

''آپ غلط سمجھے۔ ذرا بھی شاعرانہ نہیں۔ سانجھ ایک قصبے کا نام ہے اور تارہ ایک بھنگی ہے جو اس قصبے میں رہتا ہے''۔

''یہ بات ہے، ہاں تو پلاٹ کیا ہے!''۔

''پلاٹ؟ پلاٹ کچھ بھی نہیں۔ بھلا جدید افسانے میں کہیں پلاٹ بھی ہوتا ہے؟''

''پلاٹ نہ سہی۔ افسانہ کے مرکزی خیال ہی سے آگاہ فرمائیے''۔

''مرکزی خیال یہ ہے کہ تارہ جھاڑو لگا رہا ہے۔ اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ وہ خواب میں جھاڑو لگانے لگتا ہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ کوئی اور بھنگی اس کی جھاڑو اٹھا کر لے گیا ہے''۔

''مرکزی خیال بہت زوردار ہے''۔

''ہے نا؟ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اچھا اب افسانہ سنئے''۔

انہوں نے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ اور ہم دل ہی دل میں حیران ہونے لگے کہ پندرہ صفحے پڑھے جا چکے لیکن ابھی تک انہوں نے ''سانجھ'' یا ''تارہ'' کا ذکر نہیں کیا۔ ابھی تو وہ اس بات کی وضاحت فرما رہی ہیں کہ افسانہ لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ہم نے اکتا کر پوچھا۔

''آپ نے افسانہ لکھا ہے یا ناول؟''۔

''جناب یہ ناول ہے نہ افسانہ۔ اسے کہتے ہیں طویل مختصر افسانہ!''

''ہماری رائے میں تو اسے طویل طویل افسانہ کہنا چاہیے''۔

''آپ ابھی سے گھبرا گئے۔ابھی تو تمہید بھی مکمل نہیں ہوئی''۔

''بات یہ ہے کہ ہمیں نیند آ رہی ہے آپ یہ افسانہ ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔کبھی طویل فرصت میں پڑھ لیں گے''۔

''افسانے کا لطف اسی وقت آتا ہے جب آپ اسے افسانہ نویس کی زبان سے سنیں ،بس اب تیس صفحے ہی تو باقی ہیں''۔

طوعاًوکرہاً افسانہ سننا پڑتا ہے۔

خدا خدا کر کے جب افسانہ ختم ہوتا ہے تو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔کہ آئندہ کسی ادیب سے نہیں کہیں گے۔

''کوئی تازہ تخلیق سنایئے''۔

کیونکہ جہاں تک ہندوستانی ادباء اور شعراء کا تعلق ہے،ان پر عاشق کی مانند غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسا باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

☆☆☆

مانگے کی کتابیں

انجیل مقدس میں آیا ہے کہ کتابوں کی انتہا ہے نہ ان کا شمار! یہی وجہ ہے کہ ان اشخاص کو بھی جن کے پاس کتابوں کے ذخائر ہیں، کچھ نہ کچھ کتابیں مانگ کر پڑھنی پڑتی ہیں۔ایک اور طریقہ انہیں چرا کر پڑھنے کا بھی ہے لیکن چوری کوئی خاص اچھی عادت نہیں۔نیز پکڑے جانے کا بھی احتمال رہتا ہے۔اس لیے شرفا کتابیں مانگنے کو کتابیں چرانے پر ترجیح دیتے ہیں۔

مانگنا بذات خود ایک ناخوشگوار فعل ہے۔میں دعا مانگنے کے متعلق عرض نہیں کر رہا۔کپڑے، کتابیں اور ووٹ مانگنے کا ذکر کر رہا ہوں۔ہندی کے ایک شاعر نے کہا ہے۔مانگنا ایک قسم کی اخلاقی موت ہے لیکن سائل کو انکار کرنا مانگنے سے بھی بدتر ہے۔کتابیں مانگنے والے اس نکتے سے بخوبی

واقف ہیں۔ کاش وہ حضرات بھی اس سے اتنے باخبر ہوتے جن سے کتابیں مانگی جاتی ہیں۔

ہمارے ایک دوست میں جن سے جب ہم کوئی کتاب مانگتے ہیں، ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ انکار بھی نہیں کرتے لیکن کتاب مستعار دینے پر آمادہ بھی نظر نہیں آتے، حتیٰ کہ ان کے دلائل سن کر ہم یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

''نہیں'' ہی کیوں نہیں کہتے زباں سے
''نہیں'' کا کام کیوں لیتے ہو ''ہاں'' سے

بڑی نارضامندی کے ساتھ وہ کتاب ہمارے حوالے کرتے ہیں۔ اسے لے کر ہم ابھی مشکل سے گھر پہنچتے ہیں کہ ان کا خادم یہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہے کہ اگر ہم نے کتاب پڑھ لی ہو تو اسے واپس کر دیں۔ بسا اوقات ہم اسے پڑھے بغیر واپس بھجوا دیتے ہیں۔ ہمارے اس دوست کا عقیدہ ہے کہ اپنی گھڑی، اپنا قلم اور اپنی کتاب کسی شخص کو مستعار نہیں دینی چاہیے، کیونکہ اول تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور اگر کیا جائے گا اس کا حلیہ بگاڑ کر۔ یہ جب کسی کمزوری کے لمحے میں کتاب مستعار دیتے ہیں، تو ہدایت اور نصیحت کے ملے جلے انداز میں فرماتے ہیں ''دیکھئے صاحب، یہ بڑی نایاب کتاب ہے۔ مرحوم دادا جان کو ایک انگریز نے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔ خدا بخشے دادا جان فرمایا کرتے تھے کہ ''کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ اسے ذرا سنبھال کر رکھئے گا اور ہاں پڑھتے وقت کسی صفحے پر روشنائی سے نشان یا دھبہ مت لگائیے گا۔ بچوں سے اسے خاص طور پر بچا کر رکھئے گا۔ کہیں کوئی تصویر یا صفحہ اڑا نہ لے جائیں۔ دیکھئے اس کتاب کی صرف دو جلدیں دستیاب ہیں۔ ایک تو برٹش میوزیم لندن میں ہے اور دوسری خاکسار کے پاس''۔

لطف یہ کہ وہ ہر ایک کتاب کے بارے میں یہی کچھ کہتے ہیں۔ حالانکہ جن کتابوں کو نایاب قرار دیتے ہیں، بڑی آسانی سے کسی بھی کتاب فروش سے مل سکتی ہیں۔ تاوقتیکہ انہیں کتاب واپس نہ مل جائے، انہیں چین نہیں آتا۔ جب کبھی ملاقات ہوتی ہے، احتیاطاً پوچھ لیتے ہیں ''کتاب محفوظ ہے نا؟''۔

ایک اور صاحب ہیں جنہیں ایک خاص تاریخ تک جس کا فیصلہ شروع میں کر لیا جاتا ہے کتاب واپس نہ کی جائے، تو طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ بھاگم بھاگ ہمارے ہاں آتے ہیں اور

چھوٹتے ہی کہتے ہیں۔ ''دیکھو بھئی، آج پندرہ تاریخ ہے اور تم نے ہماری کتاب واپس نہیں کی''۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہم بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کی کتاب پڑھ کر کہاں رکھ دی تھی۔ اس وقت ان کا غیظ وغضب دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ اتنے کو سنے دیتے ہیں کہ ہم کان کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ آئندہ بڑی سے بڑی حماقت کریں گے لیکن ان سے کتاب نہیں مانگیں گے۔ وہ شکایت آمیز لہجے میں کہے چلے جاتے ہیں۔ ''ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ یہ کتاب ضرور گم کر دیں گے دراصل پ ایسے غیر ذمہ دار اور لاپرواشخص کو کتاب، مستعار دینا اس سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔ آپ نے ضرور کتاب ردی میں بیچ دی ہوگی۔ آپ پر تو مال مفت اور دل بے رحم والی مثل صادق آتی ہے۔ جب آپ مانگی ہوئی چیز کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتے تو آپ کو اسے مانگنے کا کیا حق پہنچتا ہے''۔

ادھر ہم جھلا کر کہتے ہیں۔ ''آپ خوانخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ کہیں مل جائے گی''۔

''بس اب مل چکی کتاب۔ اگر اسے ملنا ہوتا تو گم ہی کیوں ہوتی۔ ہمیں تو آپ کی بجائے اپنے پر غصہ آرہا ہے۔ ہم نے وہ کتاب آپ کو دی ہی کیوں تھی''۔

اتنے میں ہمیں ان کی کتاب مل جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر ان کی جان میں جان آتی ہے۔ وہ ایک بار تسلی کرنے کے بعد، یہ وہی کتاب ہے، فرماتے ہیں! ''قسم ہے خداوند کریم کی اگر آئندہ آپ کو کبھی کتاب مستعار دی''۔ اور ہم دل ہی دل میں عہد کرتے ہیں ''لعنت ہے ہم پر اگر ہم نے آئندہ آپ سے کوئی کتاب مانگی''۔

ہمارے ایک اور دوست کسی گمنام کالج میں گمنام پروفیسر ہیں۔ یہ پچھلے بارہ برس سے کسی گمنام موضوع پر ریسرچ کرتے ہیں۔ چونکہ ہر دوسرے سال ریسرچ کا موضوع بدل دیتے ہیں، اس لیے ان کا تھیسیس کبھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ ان کے پاس لاتعداد پھٹی پرانی کتابیں ہیں جنہیں یہ ہر وقت سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ یہ پہلے خود کسی کتاب کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ پھر یہ بتاتے ہیں کہ انہیں یہ کتاب کسی پنساری سے کونسا سفوف خریدتے وقت دستیاب ہوئی تھی۔ پھر اسے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں لیکن جب ہم پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں تو لیت ولعل کرنے لگتے ہیں۔ آخر یہ طے پاتا ہے کہ ہم یہ کتاب صرف ایک دن کے لیے لے جا سکتے ہیں لیکن ہمیں اسے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن احتیاط کرنا ہوگی۔

ایک دفعہ شامت اعمال سے ان کی ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ کتاب ہم سے ضائع ہوگئی۔ دراصل ہمارے نوکر نے اسے نہایت فضول تصنیف سمجھتے ہوئے چولھے میں جھونک دیا۔ بس پھر تو غضب ہوگیا۔ بہت سیخ پا ہوئے۔ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے اور کہتے تھے ''آپ نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں برباد ہوگیا۔ اس کتاب کی مدد سے مجھے ''موہنجوداڑو کی تہذیب'' پر تھیسیس لکھنا تھا۔ اب میں عمر بھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کر سکتا''۔

ہم نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور بہت دیر تک کتاب کے یوں ضائع ہو جانے پر اظہار تاسف کرتے رہے لیکن ان کی کسی طرح تسلی نہ ہوئی۔ اب ان کا یہ معمول ہوگیا کہ جہاں بھی ہوتے جس حال میں بھی ہوتے اس بات کا چرچا ضرور کرتے کہ ان کے ''ڈاکٹر'' نہ بننے کی تمام تر ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ حالانکہ ہم بخوبی جانتے تھے کہ ہمارے علاوہ اس المیہ میں ان کی نااہلیت کا بھی کافی ہاتھ ہے لیکن مصلحتاً چپ رہتے۔ ایک دن جب ان کے ایک دوست کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی تو وہ از سرنو ہمارے پاس شکایت کرنے آئے کہ اگر ہم سے ان کی وہ کتاب ضائع نہ ہوگئی ہوتی تو آج وہ بھی ''پی ایچ ڈی کہلاتے''۔

ان کا شکوہ سن کر ہم اتنے خفیف ہوئے کہ ہم نے تہیہ کر لیا چاہے ہمیں چار کھونٹ گھومنا پڑے، زمین و آسمان کے قلابے ملانے پڑیں۔ ہم ان کی کتاب ڈھونڈ نکالیں گے۔ بڑی بڑی لائبریریوں سے دریافت کیا، پرانے کتب فروشوں کو لکھا، لیکن کہیں سے کتاب دستیاب نہ ہوئی۔ ایک دن جب ہم مایوس ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تو پان کھانے کے لیے ماتا دین پنواڑی کی دکان پر رکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ماتا دین اسی کتاب کے اوراق میں گاہکوں کو پان باندھ باندھ کر دے رہا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کے پاس اس کتاب کی پچاس جلدیں ہیں جو اس نے ایک کباڑی سے آٹھ آنے فی سیر کے حساب سے خریدی ہیں۔ ہم نے فوراً ایک نسخہ موازی تین آنے میں ماتا دین سے خریدا اور کتاب پروفیسر صاحب کے حوالے کی حالانکہ انہیں کتاب ملے چار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن ابھی تک وہ پی ایچ ڈی نہیں ہو سکے۔

کتابیں مانگنے کے سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ کبھی اس شخص سے کتاب نہیں مانگنی چاہیے جو پرلے درجے کا سنکی ہو اور جس کو ہر وقت کتاب گم ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ پرانی اور بوسیدہ

کتاب نہیں مانگنی چاہیے کیونکہ اسے آپ کی بیوی یا نوکر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گا۔وہ کتاب نہیں مانگنی چاہیے جس کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہو کیونکہ اگر وہ گم ہوگئی تو کتاب کا مالک آپ کو حشر تک معاف نہیں کرے گا اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ کتاب کبھی مانگنی ہی نہیں چاہیے ۔خرید کر پڑھنی چاہیے کہ اس طرح آپ کے علاوہ مصنفوں اور ناشروں کا بھی بھلا ہوگا۔

☆☆☆

انصاف کہاں ہے

اگر امجد ان دنوں یہ مصرع بار بار دہراتا ہے۔

انصاف کو آواز دو، انصاف کہاں ہے؟ تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ اس کی امی نے حلوا تقسیم کرتے وقت اس کے ساتھ نا انصافی کی تھی۔ یا بڑے بھائی صاحب نے بلا وجہ تھپڑ مارا بلکہ ششماہی امتحان میں اسے فیل کر دیا گیا۔ جہاں تک اس معاملے میں امجد کی رائے کا تعلق ہے، اس نے ہر ایک سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دیا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ممتحن کو اس کے جوابات پسند نہیں آئے۔حساب کے پرچے کو ہی لیجیے ۔ پہلا سوال تھا۔

ایک قلعے میں پچاس آدمیوں کے لیے بیس دن کی خوراک موجود ہے۔اگر دس دن کے بعد وہاں پچیس آدمی اور آجائیں تو یہ خوراک کتنے دنوں کے لیے کافی ہوگی؟

امجد نے اس سوال کو حل کرتے ہوئے لکھا ''اگر وہ پچیس آدمی پیٹو قسم کے نوجوان ہیں تو ساری خوراک ایک دن میں چٹ کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر ان کا ہاضمہ خراب رہتا ہے تو یہ خوراک کافی دن چل سکتی ہے، چونکہ سوال میں اس بات کی تشریح نہیں کی گئی کہ ان نوجوانوں کے ہاضمے کا کیا حال ہے، اس لیے پورے یقین کے ساتھ یہ کہنا کہ خوراک کتنے دنوں کے لیے کافی ہوگی، بہت مشکل ہے''۔

دوسرا سوال تھا۔بیس آدمی یا دس عورتیں ایک کام کو پندرہ دن میں کر سکتی ہیں۔ بتاؤ اس کام کو چالیس عورتیں کتنے دنوں میں کریں گی؟''

امجد کا جواب ملاحظہ فرمایئے!''عورتیں کام کرنے کی بجائے باتیں کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔پھر جہاں چالیس عورتیں اکٹھی ہو جائیں، وہاں اچھا خاصہ مباحثہ یا بلوہ تو ہو سکتا ہے، کام

نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہماری رائے میں وہ کام وہیں رہے گا جہاں چالیس عورتوں کے آنے سے پہلے تھا۔ اگر یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لیجئے"۔

تیسرا سوال سود کے قاعدے سے متعلق تھا۔ "اگر موہن لال بنارسی داس کو پانچ سو روپے چار فی صد سالانہ شرح پر قرض دے تو اسے سات سال کے بعد کتنا سود ملے گا"۔

امجد صاحب نے اس سوال کو یوں حل کیا! "اگر یہ وہی بنارسی داس ہے جو ہمارے محلے میں رہتا ہے تو موہن لال صاحب اطمینان رکھیں، انہیں ایک کوڑی بھی بطور سود نہیں ملے گی، کیونکہ بنارسی داس (جنہیں دراصل بنارسی ٹھگ کہنا چاہیے) کی عادت ہے کہ وہ سود کے ساتھ اصل زر بھی پی جاتے ہیں۔ البتہ یہ کوئی اور صاحب ہیں، تو جتنا سود حساب سے بنے گا، موہن لال کو مل جائے گا"۔

چوتھے سوال میں یہ پوچھا گیا تھا ایک شخص نے ایک بھینس بیس روپے میں فروخت کی اور اسے دس فیصدی نقصان ہوا۔ اگر وہ اسے تیس روپے میں بیچتا تو اسے کتنے فیصد نفع ہوتا"۔

امجد نے اس سوال کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔

آج کل جب کہ ایک اچھی بکری بھی بیس روپے میں فروخت نہیں کی جاتی، یہ فرض کر لینا کہ بھینس اتنے روپوں میں بیچی گئی، قیاس اور عقل کے خلاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھینس بالکل، بوڑھی اور ناکارہ تھی۔ اگر یہ بات ہے تو اس کو فروخت کرنے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ہمارے خیال میں تو بھینس کے مالک کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسے ایسی بے کار چیز سے نجات ملی اور ساتھ ہی بیس روپے بھی مل گئے۔ ظاہر ہے کہ جس بھینس کی قیمت مشکل سے بیس روپے طے پائی، اسے تیس روپے میں کون بے وقوف خریدے گا۔ اس لیے کسی قسم کے نفع کی توقع نہیں کی جاسکتی"۔

ایک اور سوال تھا۔ ایک بندر ایک بانس پر چڑھتے وقت ایک منٹ میں تین فٹ چڑھتا ہے تو ایک فٹ پھسل کر پھر نیچے آجاتا ہے۔ اگر بانس کی لمبائی بیس فٹ ہو تو بانس کے سرے تک پہنچنے میں بندر کو کتنے منٹ لگیں گے؟"

امجد نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ عام بندروں کی طرح یہ بندر بھی بڑا شرارتی ہے اور وہ جان بوجھ کر پھسلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ورنہ اگر وہ چاہے تو محض ایک چھلانگ

میں بانس کے سرے تک پہنچ سکتا ہے، لیکن جب نیت میں فتور ہو اور خوامخواہ وقت ضائع کرنے کو جی چاہے تو پھر کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ بندر منزل مقصود پر کب پہنچے گا۔ ویسے یہ بات بھی یقین کے قابل نہیں کہ وہ پورے تین فٹ چڑھنے کے بعد ایک فٹ نیچے کو لڑھک آتا ہے کیونکہ جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، بندروں کے پاس فاصلہ ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا اور بغیر کسی پیمانے کے پورے تین فٹ چڑھنا یا ایک فٹ پھسلنا ناممکن ہے''۔

باقی پرچوں میں بھی امجد نے اسی قسم کی ذہانت کا ثبوت دیا۔ مثلاً تاریخ کے پرچے میں ایک سوال تھا ''حیدر علی پر ایک مختصر نوٹ لکھو''۔

''امجد نے لکھا۔ خواجہ حیدر علی آتش اردو کے مشہور شاعر تھے۔ آپ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور 1263 ہجری میں وفات پائی۔ آپ کا کلام بے نظیر ہے''۔

چند اور سوالات کے جوابات بھی قابل داد تھے۔ جیسے

سوال: دھرم سالہ کہاں واقع ہے؟

جواب: قریب قریب ہر شہر میں۔ کیونکہ ہر ایک شہر میں مندر کے علاوہ ایک آدھ دھرم سالہ ضرور ہوتی ہے''۔

سوال: ان محاوروں کا مطلب بیان کرو۔

(1) اندھیرے گھر کا اجالا۔

(2) تین میں نہ تیرہ میں۔

(3) دریا کو کوزے میں بند کرنا۔

جواب: ''اندھیرے گھر کا اجالا'' سے مراد وہ چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے جسے غریب لوگ اپنے جھونپڑوں میں شام کے وقت جلاتے ہیں۔

''تین میں نہ تیرہ میں'' یعنی ایسا عدد جو نہ تین اور تیرہ میں شامل ہو جیسے پانچ چھ، سات وغیرہ۔

''دریا کو کوزے میں بند کرنا'' یعنی کوئی بے وقوفی کی بات کرنا۔ ظاہر ہے کہ دریا کو کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: یہ شعر کس کا ہے؟

سن چکے حال بس ترا آزاد
ہم سے آگے سنا نہیں جاتا

جواب: غالباً یہ شعر مولوی محمد حسین آزاد یا مولانا ابوالکلام آزاد ماسٹر جگن ناتھ آزاد کا ہے۔

آپ نے امجد کے جوابات ملاحظہ فرمائے۔اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ کیا اسے فیل کر کے اس کے ساتھ ظلم نہیں کیا گیا اور کیا وہ یہ مصرع گنگنانے میں حق بجانب نہیں ہے۔

انصاف کو آواز دو، انصاف کہاں ہے؟

☆☆☆

خدام ملت

کردار۔اخباری نمائندہ
حکیم لفتہ
پرنسپل پلٹہ
بیگم استغفار

(اخباری نمائندہ حکیم لفتہ کے مطب کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

حکیم لفتہ:۔تشریف لے آیئے۔دروازہ کھلا ہے۔

(اخباری نمائندہ مطب میں داخل ہوتا ہے)

اخباری نمائندہ:۔آداب عرض۔حکیم صاحب

حکیم لفتہ:۔آداب عرض آپ کی تعریف؟

اخباری نمائندہ:۔میں اخبار ''انکشاف'' کا نمائندہ ہوں۔

حکیم لفتہ:۔اچھا تو کیا شکایت ہے آپ کو۔شاید آپ کا جگر خراب ہو گیا ہے یا معدے میں نقص ہے۔خیر کوئی بات نہیں ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔

اخباری نمائندہ:۔نہیں، حکیم صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں مشورہ نہیں انٹرویو کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔

حکیم لفتہ:۔اچھا تو آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔جلدی کیجئے میرا وقت بہت قیمتی ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ آپ کا پورا نام معہ القبات وخطابات؟

حکیم لفتہ:۔ خاکسار کو شفاء الملک، خادم ملت، مسیح الزمان، حکیم حاذق، حاجی روشن دین حجازی لفتہ کہتے ہیں۔

اخباری نمائندہ:۔ لفتہ آپ کا تخلص ہے یا لقب؟

حکیم لفتہ:۔ کچھ بھی سمجھ لیجئے۔ کچھ لوگ اسے تخلص سمجھتے ہیں کچھ لقب۔ دراصل یہ تخلص ہے نہ لقب، یہ ایک دوا کا نام ہے جو خاکسار نے سات برس کی عمر میں ایجاد کی تھی۔

اخباری نمائندہ:۔ سات سال کی عمر میں! یہ دوا کس مرض کے لیے تھی؟

حکیم لفتہ:۔ اجی صاحب یہ پوچھئے کس مرض کے لیے نہیں تھی پیچش سے لے کر کالی کھانسی اور کالی کھانسی سے لے کر درد جگر اور درد جگر سے لے کر جوڑوں کے درد تک ہر مرض کا تیر بہدف علاج تھی۔

اخباری نمائندہ:۔ آپ نے علم طب کا باقاعدہ مطالعہ کس یونیورسٹی میں کیا؟

حکیم لفتہ:۔ کس یونیورسٹی میں؟ لاحول ولاقوۃ کیا کوئی شخص یونیورسٹی میں تعلیم پا کر حکیم بن سکتا ہے۔ حکمت تو حسن کی طرح داتا کی دین ہے صاحب۔

اخباری نمائندہ:۔ آپ کتنی پشت سے حکیم چلے آ رہے ہیں؟۔

حکیم لفتہ:۔ چودہ پشت کا تو مجھے علم ہے لیکن بزرگوں سے سنا ہے ہمارے خاندان کا سلسلہ حکیم ارسطو سے ملتا ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ آپ کے کسی بزرگ کے پاس حکمت کی کوئی ڈگری بھی تھی۔

حکیم لفتہ:۔ اجی حضرت ہمارے بزرگ تو اس زمانے سے حکمت کا کاروبار کر رہے ہیں جب یونیورسٹیاں معرض وجود میں نہیں آئی تھیں۔

اخباری نمائندہ:۔ کیا آپ اپنے طریقہ تشخیص پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

حکیم لفتہ:۔ ہاں صاحب کیوں نہیں۔ ہم مریض کی نبض دیکھتے ہیں نہ زبان بس صرف اس کے چہرے سے قیاس لگا لیتے ہیں کہ اسے کیا شکایت ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ لیکن آپ کا قیاس غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔

حکیم لفتہ:۔ جی ہاں اکثر غلط ہوتا ہے۔ مثلاً ہم مریض سے کہتے ہیں۔ تمہارا دل کمزور

ہے۔لیکن وہ کہتا ہے میرے کان میں درد ہے۔

اخباری نمائندہ:۔تواس صورت حال میں آپ مریض کی تسلی کس طرح کرتے ہیں؟

حکیم لفتہ:۔ہم میز پر مکا مارتے ہوئے چنگھاڑتے ہیں تم اول درجے کے جھوٹے ہو دغاباز ہو۔تم حکیم کے علاوہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔

اخباری نمائندہ:۔حکیم صاحب کبھی آپ نے اس بات کا بھی اندازہ لگایا کہ روزانہ کتنے مریض آپ قبرستان میں بھجواتے ہیں؟

حکیم لفتہ:۔صحیح اندازہ تو کبھی نہیں کیا۔لیکن خیال ہے۔سیکڑوں نہیں تو درجنوں......

اخباری نمائندہ:۔آپ کو کبھی اس بات پر ندامت تو نہیں ہوئی کہ آپ درجنوں مریض کو اللہ گنج بھجوار ہے ہیں؟۔

حکیم لفتہ:۔ندامت کا یہ کونسا مقام ہے صاحب، یہ تو ایک طرح کی قومی خدمت ہے، خاص طور پر ایسے ملک میں جہاں آبادی اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

اخباری نمائندہ:۔واقعی آپ صحیح معنوں میں خادم ملت ہیں۔

حکیم لفتہ:۔یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے وگرنہ من آنم کہ من دانم

اخباری نمائندہ:۔اچھا حکیم صاحب یہ فرمایئے آپ کے علاوہ بھی اس محلے میں کوئی خادم ملت رہائش پذیر ہے؟

حکیم لفتہ:۔ہاں ہاں کیوں نہیں۔شری الٹا پرشاد پلٹہ پرنسپل انٹرنیشنل کالج ہمارے محلے ہی میں رہتے ہیں۔

اخباری نمائندہ:۔اچھاتواب اجازت دیجئے، میں ذراان سے بھی ملاقات کرلوں۔آداب عرض۔

حکیم صاحب:۔آداب عرض۔

وقفہ

اخباری نمائندہ:۔پلٹہ صاحب، مدت سے خواہش تھی آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے۔

پرنسپل پلٹہ:۔شاید آپ کسی عزیز کو میرے کالج میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔

اخباری نمائندہ:۔جی نہیں میں آپ سے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔

پرنسپل پلٹہ: توشروع کیجئے۔

اخباری نمائندہ:۔آپ نے اپنے نام کے ساتھ جوایک درجن ڈگریاں لگارکھی ہیں وہ آپ نے کس یونیورسٹی سے حاصل کیں اوران ڈگریوں کے کیا معنی ہیں؟

پرنسپل پلٹہ:۔یہ میرا تجارتی راز ہے۔میں آپ کو کیسے بتاسکتا ہوں۔

اخباری نمائندہ:۔پھربھی ایک آدھ کی تشریح فرمادیجئے۔

پرنسپل پلٹہ:۔آپ اصرار کرتے ہیں توایک ڈگری کی وضاحت کردیتا ہوں۔یہ ڈگری ہے۔

C.N.P.M.E.O.A.U.

اس کے معنی ہیں۔

Could never pass matriculation examination of any univeristy.

یعنی خاکسار کسی یونیورسٹی سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس نہیں کرسکا۔

اخباری نمائندہ:۔آپ اس کالج کے پرنسپل کس طرح مقرر ہوئے؟

پرنسپل پلٹہ:۔واہ صاحب۔یہ کالج خود ہم نے کھولا۔اگر ہم اس کے پرنسپل نہیں ہوں گے تو کیا آپ ہوں گے۔

اخباری نمائندہ:۔آپ کے پاس سٹاف کتنا ہے؟

پرنسپل پلٹہ:۔کافی ہے،میرے علاوہ میری بیوی،میری سالی،میرا بہنوئی اور میرا ہم زلف،اس کالج کے سٹاف پر ہیں۔

اخباری نمائندہ:۔ان سب نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔

پرنسپل پلٹہ:۔کسی نے شاہدرہ تک،کسی نے غازی آباد تک اور ایک نے گوڑگاؤں تک۔

اخباری نمائندہ:۔پرنسپل صاحب آپ نے شاید یہ شعر سنا ہوگا۔

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

پرنسپل پلٹہ:۔شعر بہت اچھا ہے لیکن شاید آپ نے یہ مقولہ نہیں سنا،روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر!

اخباری نمائندہ:۔آپ نے کبھی یہ سوچا کہ آپ کی بدولت سیکڑوں طلباء ہر سال فیل ہورہے ہیں۔
پرنسپل پلٹہ: یہ سوچنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ بھی ایک قسم کی قومی خدمت ہے۔
اخباری نمائندہ:۔وہ کیسے؟
پرنسپل پلٹہ:۔وہ ایسے کہ اگر وہ سب پاس ہوجاتے تو تعلیم یافتہ بیکاروں کی تعداد میں اضافہ کرتے۔
اخباری نمائندہ:۔واقعی آپ خادم ملت ہیں۔اچھا یہ فرمائیے کوئی اور خادم ملت بھی آپ کے آس پاس رہتا ہے۔
پرنسپل پلٹہ:۔جی ہاں۔بیگم استغفار ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں۔کیا ان سے بھی ملاقات کیجئے گا؟
اخباری نمائندہ:۔اگر وہ نزدیک رہتی ہیں تو میں ضرور ان سے ملاقات کروں گا۔

وقفہ

بیگم استغفار:۔اچھا تو آپ انٹرویو لینے آئے ہیں؟۔
اخباری نمائندہ:۔آپ بجا فرماتی ہیں۔
بیگم استغفار:۔تو آپ کو میری تازہ ترین فوٹو بھی چاہیے ہوگی۔لیجئے پہلے آپ کو فوٹو دے دوں۔
اخباری نمائندہ:۔شکریہ۔
بیگم استغفار:۔اسے کسی نمایاں جگہ پر شائع کیجئے گا۔میرا مطلب ہے آگے صفحہ نمبر ایک پر کسی وجہ سے نہ چھپ سکے تو صفحہ نمبر دو پر ضرور چھپنی چاہیے۔
اخباری نمائندہ:۔ایسا ہی ہوگا۔
بیگم استغفار:۔اب کہئے آپ کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟
اخباری نمائندہ:۔کیا یہ صحیح ہے کہ پچھلے بیس سے آپ قوم کی خدمت کررہی ہیں؟۔
بیگم استغفار:۔یہ صحیح نہیں۔بیس سال پانچ ماہ صحیح ہے۔
اخباری نمائندہ:۔اب تک آپ نے قوم کے لیے کیا کیا ہے؟
بیگم استغفار:۔میں نے سیکڑوں بے بس بیویوں کو ان کے ظالم شوہروں سے نجات دلائی، کتنی ہی بہوؤں کو ساس کے مار پیٹ سے بچایا اور کتنے ہی آوارہ نوجوانوں کو جیل خانے بھجوایا۔

اخباری نمائندہ:۔ کیا یہ درست ہے کہ آپ اپنی دونوں بہوؤں کو روزانہ پیٹتی ہیں۔اپنے شوہر کا دم ناک میں کر رکھا ہے اور آپ کے تینوں لڑکے آوارہ ہیں؟

بیگم استغفار:۔ بالکل نہیں۔

اخباری نمائندہ:۔ وجہ؟

بیگم استغفار:۔ وجہ یہ کہ خادم ملت اپنی نہیں ہمیشہ ملت کی خدمت کرتا ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ آپ یہ جو کار خیر کر رہی ہیں، اس کے لیے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟

بیگم استغفار:۔ قوم کی جیب سے۔

اخباری نمائندہ:۔ کیا یہ صحیح ہے آپ نے اس چندے سے ایک شاندار کوٹھی اور ایک پر تکلف کار خریدی ہے؟۔

بیگم استغفار:۔ یہ صحیح ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ آپ ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟

بیگم استغفار:۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے، جو شخص قوم کی خدمت کرتا ہے قوم اس کی خدمت کرتی ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ کیا یہ درست ہے کہ جو یتیم خانہ آپ نے کھول رکھا ہے، اس سے آپ کو تین ہزار سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے؟

بیگم استغفار:۔ یہ درست ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا۔ آپ قوم کی بجائے اپنی خدمت کر رہی ہیں۔

بیگم استغفار:۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک طرح کی قومی خدمت ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ وہ کیسے؟

بیگم استغفار:۔ کیا بندی قوم کی فرد نہیں۔اس لیے اگر وہ اپنی خدمت کرتی ہے تو وہ بھی تو قوم کی خدمت ہے۔

اخباری نمائندہ:۔ سبحان اللہ کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔

بیگم استغفار:۔ جی ہاں۔اسی لیے تو اکبر الہٰ آبادی نے کہا تھا

بنتی رہیں گی قومیں آباد گھر تو کر لے

اخباری نمائندہ:۔ آپ واقعی خادم ملت ہیں۔آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔

بیگم استغفار:۔ خدام ملت سے مل کر کس کو مسرت نہیں ہوتی۔

اخباری نمائندہ:۔ اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔

بیگم استغفار:۔ خدا حافظ۔

☆☆☆

ایک آرٹسٹ

ایک دن میرے دوست پروفیسر بشیر احمد نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ خدا اور بیوی کے بعد اگر وہ کسی شخص سے ڈرتے ہیں، تو وہ ان کا خانساماں ہے۔ میں نے کہا۔ بچوں کی طرح ہم سب ایک نہ ایک ہوے سے ساری عمر ڈرتے رہتے ہیں۔ کسی کا ہوا کالج کا پرنسپل ہے، اور کسی کا دفتر کا سپرنٹنڈنٹ۔ پروفیسر بشیر احمد نے پوچھا ''اور تمہارا ہوا؟'' میں نے جواب دیا۔ ویسے تو میں متعدد چیزوں سے خائف رہتا ہوں۔ مثلاً مالک مکان سے جو ہر صبح کرائے کا تقاضا کرتا ہے، اپنے ڈاکٹر سے جس کا بل میں نے چھ مہینے سے نہیں چکایا اور اپنے ہمسائے کے کتے سے جو دو دفعہ مجھے کاٹ چکا ہے۔ مگر ان سب سے بڑھ کر میں اپنے ان احباب سے ڈرتا ہوں، جو اپنے آپ کو ''آرٹسٹ'' کہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ذرا مسکرا کر کہا۔ ''وہ کیسے؟'' میں نے کہا ''یونہی ذرا یہ لوگ کچھ عجیب سے واقع ہوئے ہیں۔ ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے''۔ میرے دوست کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ کہنے لگے۔ ''تم آرٹسٹوں سے کھلی ناانصافی کر رہے ہو''۔ میں نے کہا۔ ''میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہو۔ اس کے بعد آپ خود فیصلہ کر لیجئے گا کہ میں نے جو کچھ کہا۔ ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں''۔ پروفیسر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا سنائیے''۔

میں نے کہا سنئے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پچھلی گرمیوں میں میں گلمرگ گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک اوسط درجے کی کوٹھی جس کا نام ''پیراڈائس'' تھا، کرائے پر لی۔ اور اپنی قیام گاہ کا پتا اپنے سب احباب کو لکھ بھیجا۔ پتا لکھنا تو صرف بہانہ تھا۔ دراصل ان پر ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں کس طرح ان سب پر بازی لے گیا ہوں۔ یعنی جب وہ لاہور اور ملتان جہنموں میں جل رہے ہیں، میں نو ہزار فٹ کی بلندی پر بیٹھ کر چائے نوش کر رہا ہوں۔ میرے خطوط کو پہنچنا تھا کہ چہار اطراف سے دوستوں نے جواب میں خط لکھنے شروع کر دیئے کہ وہ پہلی فرصت میں میرے پاس

گلمرگ آ رہے ہیں۔ خیر بہت سے دوستوں نے تو آ نے کی دھمکی دی۔ مگر ایک صاحب نے جو کچھ لکھا اس پر عمل بھی کیا۔ یہ میرے ''آرٹسٹ'' دوست دیویندر بھائی تھے۔ اب یہ صحیح ہے کہ اگر کسی شخص سے میں کوسوں دور بھاگنا چاہتا ہوں تو وہ بھائی دیویندر ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ تین سومیل کے فاصلے پر میں بھائی دیویندر سے بالکل محفوظ ہوں۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ عزرائیل کی طرح وہ ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ مختصر سا سامان لے کر اتوار کو گلمرگ پہنچ رہا ہوں۔ مگر جب تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک ''مختصر'' اور ''مفصل'' میں بہت کم فرق ہے۔ ان کا مختصر سا سامان ایک وزنی بستر، متعدد چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں، دو جہازی ٹرنکوں، ایک بندریا۔ اور ایک کتے کے پلے پر مشتمل تھا۔ چونکہ آپ اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتے ہیں۔ اس لیے ہر بات میں جدت پیدا کرنا آپ کا خاصہ ہے۔ چنانچہ جب موٹر سے اترے تو آپ کے کندھے پر بندریا تھی اور ہاتھ میں پلے کی رسی۔ کالر الٹا لگا رکھا تھا۔ اور سر کے بال بے طرح بڑھ رہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اور گھر تک تمام راستہ اپنے ہم سفروں کی کورذوقی کا ماتم کرتے آئے۔ کیونکہ ان میں سے کئی اصحاب آپ کی بندریا پر پھبتیاں اڑاتے رہے تھے۔ میں نے ان کے پاس خاطر سے ہمدردی کے چند کلمات کہے اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے ''پیراڈائس'' میں پہنچ گئے......

دوسرے دن میں انہیں سیر کے لیے گیا۔ مگر مجھے پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ بھائی دیویندر کو ساتھ لے جانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ آپ راہ چلتے ہوئے اپنی دونوں انکھیں قدرتی مناظر پر رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو کسی راہ گیر کے ساتھ ٹکر کھاتے ہیں یا ہر آدھ گھنٹے کے بعد کسی درخت یا چٹان سے سر پٹکتے ہیں۔ چنانچہ پہلی دفعہ جب وہ ایک یورپین لیڈی کے ساتھ ٹکرائے تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ دیدہ دانستہ اس سے بغلگیر ہونے لگے تھے، وہ خاتون بیچاری بہت گھبرائی اور میں نے معذرت پیش کر کے معاملہ سلجھا دیا۔ مگر اس کے بعد دیویندر بھائی نے تقریباً ہر ایک راہ گیر سے ٹکرانا اپنا معمول بنا لیا اور میں انہیں ایک لمحہ میں ''کیا دلفریب منظر ہے''۔ اور دوسرے میں ''معاف کرنا صاحب، چوٹ تو نہیں لگی'' کہتے ہوئے سنتا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا کہ ان کو سڑک پر چلنا بھی نہیں آتا۔ یہ سمجھ کر کہ اگر سڑک پر یہ اس طرح ہر کہ

دمہ سے ٹکراتے رہے تو شاید ہاتھا پائی تک نوبت پہنچے۔ میں انہیں ایک پگ ڈنڈی کی جانب لے گیا۔ یہ ایک نہایت تنگ اور پتھریلا راستہ تھا، اور میں نے انہیں ذرا محتاط ہو کر چلنے کو کہا۔ مگر وہ عادت سے مجبور تھے، اس لیے برابر ادھر ادھر جھانکتے جاتے تھے۔ یکلخت جب کہ وہ شاید دور افق کی طرف کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کا پاؤں پھسلا اور قبل اس کے کہ میں انہیں سنبھال سکتا، وہ نیچے ڈھلوان پر لڑھک چکے تھے۔ ان کے اس طرح گرنے پر مجھے پہلے تو مسرت ہوئی۔ سوچا ان کو یہیں پڑا رہنے دوں، اور سیدھا گھر لوٹ چلوں۔ مگر پھر خیال آیا آخر مہمان ہیں۔ اس لیے ان کو یہاں سے نکالنا میرا فرض ہے۔ خوش قسمتی سے گہرائی زیادہ نہ تھی اور ایک دو آدمی اتفاق سے آس پاس موجود تھے۔ ان کی اور چند مزدوروں کی مدد سے بھائی صاحب کو نکالا گیا۔ پتہ چلا کہ اپ کا پاؤں بری طرح لچک گھا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے انہیں گھوڑے پر بیٹھا کر گھر لائے۔

کوٹھی کے نزدیک کسی ڈاکٹر یا طبیب کا دواخانہ نہ تھا۔ اس لیے ایک کشمیری پہلوان کو جو موچ نکالنے میں ماہر تھا، بلا لائے۔ اب وہ بھائی صاحب کے پاؤں پر مالش کرنا چاہے تو بھائی صاحب اسے ہاتھ نہ لگانے دیں۔ وہ ہاتھ آگے بڑھائے اور یہ پاؤں پیچھے ہٹائیں۔ یہ کھیل بڑی دیر تک جاری رہا۔ آخر کشمیری پہلوان نے ایک دفعہ لپک کر جو پیر پکڑا تو بھائی دیویندر نے ایک بلند چیخ مار کر پہلوان کی پھرتی کی داد دی اور ''ہائے مر گیا'' کہہ کر اوندھے منہ فرش پر گر پڑے۔ اس کے بعد جوں جوں وہ مالش کرتا گیا، بھائی صاحب کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ اور پھر وہ بے طرح ہانپنے لگے اور میری طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔

''کیوں کیا جان نکلوا کر ہی دم لو گے؟'' میں نے پہلوان کی طرف دیکھا، وہ کہنے لگا۔ ''ابھی پندرہ منٹ میں درست کیے دیتا ہوں۔ یہ تو یونہی چلاّ رہے ہیں''۔ بڑی مشکل اور خوشامد سے پہلوان صاحب کو ان کی فیس دے کر رخصت کیا۔

اس رات بھائی دیویندر نے چیخ چیخ کر گھر والوں کی نیند حرام کی۔ ہر دس منٹ کے بعد وہ پوری طاقت سے چلاتے ''ہائے میں مر گیا، اف مجھے کتنا درد ہے'' خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اور میں ایک ڈاکٹر صاحب کو جو گلمرگ، سیر کے لیے آئے تھے بلا لایا۔ انہوں نے مالش کے لیے ایک دوا دی۔ اور سینکنے کے متعلق ہدایات دیں، بہت سی تشفی دی اور چلے گئے۔ بھائی دیویندر دس دن

تک بستر میں رہے۔ اس عرصہ میں مجھے ان کی بندریا اور ان کے پلے کی دیکھ بھال خود کرنی پڑی کیونکہ بندریا ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی اور پلے پر تو وہ بکے ہوئے تھے۔

گیارہویں دن وہ سہارا لے کر چلنے کے قابل ہوئے۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ اب بندریا کو صبح و شام سیر کرانے کے ناخوشگوار فرض سے نجات ملی۔ مگر اسی دن بندریا کو کھانسی کی شکایت ہو گئی۔ اب بھائی دیویندر کے ارشاد اور اصرار کے مطابق مجھے اسے سری نگر مویشیوں کے ہسپتال میں لے جانا پڑا۔ جونہی میں سرینگر میں لاری سے اترا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا مجمع میرے پیچھے ہو لیا اور جب میں بازار میں داخل ہوا تو سب نے یہی سمجھا کہ میں کوئی پڑھا لکھا قلندر ہوں جو سری نگر بندریا کا تماشا دکھانے آیا ہے۔ اس لیے بہت سے تماشائی میرے پیچھے ہو لیے اور مجھ پر عجیب و غریب سوالات کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ مثلاً آپ کہاں سے آئے؟ بندریا کا تماشا کہاں کریں گے؟ آپ کتنے عرصے سے بیکار ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ خیر جوں توں کر کے بندریا کو ہسپتال میں دکھایا۔ دوالی اور نجرابی بسیار واپس تلمرگ پہنچا۔

دو تین دن کے بعد بھائی دیویندر بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ کچھ لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ بھائی دیویندر بیگ افسانہ نویس، مصور اور شاعر واقع ہوئے ہیں، اس لیے وہ صبح کو افسانہ لکھتے، دوپہر کو اشعار موزوں کرتے اور شام کو منظر کشی کرتے۔ عموماً ہر شام وہ مجھے کسی بلند چوٹی پر لے جاتے اور وہاں قدرت، شفق، خوبصورتی جیسے موضوعات پر لیکچر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اپنا تصویر کشی کا سامان گھر بھول آتے۔ اس حالت میں تو مجھے ان کی بندریا کو تھامنا پڑتا۔ گھنٹوں وہاں بیٹھے اپنی تصویر، ''گلمرگ میں شام کا منظر'' کھینچتے اور مٹاتے رہتے۔ یہاں تک کہ رات پڑ جاتی اور میں حیران ہوتا کہ وہ اس اندھیرے میں افق کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب بہت دیر ہو جاتی اور میں انہیں ڈرتے ڈرتے گھر چلنے کو کہتا۔ تو وہ فرمائے ''میں اب تصویر مکمل کر کے آؤں گا۔ تم میرا کھانا یہیں پہنچا دینا''۔ اور چونکہ وہ ہر روز ایک نئی چوٹی پر بیٹھ کر منظر کشی کرتے تھے۔ اس لیے نوکر کی بجائے مجھے ہی ان کا کھانا پہنچانا پڑتا تھا......

جس دن آسمان پر بادل چھائے ہوتے، اس دن بھائی دیویندر مجھے گھر نہ بیٹھنے دیتے کیونکہ مینہ میں بھیگنا ان کی دانست میں ''قدرت کے کھلے حمام'' میں نہانا تھا۔ اس لیے نہ خود

چھاتہ لے جاتے اور نہ مجھے لے جانے دیتے۔ ایک دن ہم گلمرگ سے دو تین میل دور نکل گئے۔ اتنے میں پہلے بارش اور پھر اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ میں دوڑ کر ایک چرواہے کی جھونپڑی میں پناہ گزین ہوا۔ مگر بھائی دیویندر سر سے ہیٹ اتار کر کہنے لگے۔ ''آہا کیسا دلفریب نظارہ ہے۔ کیا خوب اولے پڑ رہے ہیں''۔ باوجود کہ میں نے انہیں دو تین دفعہ جھونپڑی میں آنے کے لیے کہا مگر وہ برابر سڑک پر ننگے سر کھڑے اولوں کا نظارہ ''محسوس کرتے'' رہے......

ایک عجیب بات ان میں یہ تھی کہ ان کو وقت بے وقت افسانہ یا نظم لکھنے کے لیے نئے موضوع سوجھتے رہتے۔ چنانچہ کئی دفعہ چلتے چلتے کسی ٹھہری ہوئی موٹر کے قریب وہ کھڑے ہو جاتے اور جیب میں سے پنسل نکال کر کچھ اس طرح نوٹ کرتے کہ دیکھنے والے سمجھتے کہ موٹر کا نمبر نوٹ کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ رات کے دو یا تین بجے مجھے بیدار کرتے اور پوچھتے ''تمہارے پاس پنسل اور کاغذ کا ٹکڑا ہے؟ بڑا اچھا خیال سوجھا ہے۔ نوٹ کر لوں۔ کہیں ذہن سے اتر نہ جائے''۔ ایک رات جونہی میری آنکھ کھلی، دیکھا کہ آپ کا بستر خالی ہے، حیران ہوا کہ کہاں گئے۔ اٹھ کر ادھر ادھر ڈھونڈھا۔ تو معلوم ہوا کہ لائبریری میں بیٹھے افسانہ لکھ رہے ہیں۔ میں نے ذرا ترشروئی سے کہا۔ ''یہ کیا حماقت ہے''۔ کہنے لگے۔ ''تم چلو میں ابھی افسانہ لکھ کر آتا ہوں۔ خدا کی قسم نہایت اچھوتا پلاٹ سوجھا ہے''۔ ایک اتوار کو چند اور اصحاب کے ساتھ کھلن مرگ جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ انہیں وہاں سے ''دریائے جہلم کی روانی'' کا منظر کھینچنا مطلوب تھا۔ جب ہم سب تیار ہو گئے تو بھائی دیویندر ایک منٹ کے لیے لائبریری میں گئے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر وہ باہر نہ آئے۔ میں انہیں بلانے گیا تو دیکھا کہ لائبریری کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ آواز دی۔ کہنے لگے ''بھائی تم کھلن مرگ ہو آؤ۔ میں اب نظم مکمل کر کے ہی اٹھوں گا''۔ میں نے کہا۔ ''عجب بدتمیزی ہے''۔ کہنے لگے۔ ''بھائی اگر اب مکمل نہ ہوئی تو کولیریج کی نظم قبلائی خاں کی طرح ہمیشہ ادھوری رہے گی''......

خیر اس قسم کی عجیب وغریب حرکات کا کہاں تک شمار کروں۔ سب سے عجیب حرکت تو انہوں نے گلمرگ سے واپس آتے ہوئے کی۔ جب موٹر بانہال پہنچی تو وہاں ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے لیے اترے۔ کھانا کھانے کے بعد آپ سگریٹ لینے بازار کی جانب گئے۔ مگر پون گھنٹہ تک واپس نہ آئے۔ میں ان کی تلاش میں گیا۔ سارا بازار چھان مارا مگر پتا نہ چلا۔ بازار

سے نکل کر میں پہاڑ کی طرف گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک چشمے کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے، ماتھے پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''قبلہ یہ کیا؟'' فرمانے لگے۔ ''یہ چشمہ مجھے نہایت پسند ہے۔ اسی چشمے پر شکنتلا اور میں نے محبت اور وفا کا پیمان باندھا تھا۔ آہ! بیچاری شکنتلا اب اس دنیا میں نہیں۔ خدا اسے جنت نصیب کرے۔ مگر میں آج آنسو بہا بہا کر اس چشمے میں ایک آبشار ملا دوں گا''۔ میں نے کہا ''اٹھو! کیا بے سر وپا باتیں کرتے ہو۔ ادھر ڈرائیور سخت بیتاب ہو رہا ہے''۔ اس پر دیویندر بھائی جھنجھلا کر بولے۔ ''تمہیں کچھ تمیز نہیں۔ جذبات سے تو تم بالکل کورے ہو تمہیں مجھ سے زیادہ اپنے ڈرائیور کا خیال ہے''۔ اس کا جواب میں کیا دیتا۔ بڑی منت سماجت کی کہ اٹھو اب چلیں مگر وہ برابر آنسو بہائے چلے جاتے تھے اور کبھی کبھی رومال سے منہ پونچھ کر کہتے۔ ''پیاری شکنتلا! یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں آسانی سے بھول جاؤں گا''۔

مختصر یہ کہ میں انہیں چشمے کے کنارے بیٹھا چھوڑ کر واپس بازار میں آیا۔ کچھ دیر اور انتظار کیا۔ مگر جب وہ چار بجے تک نہ لوٹے۔ تو مجبوراً ڈرائیور سے موٹر چلانے کو کہا۔ دو ہفتے کے بعد ایک دن اتفاقاً میری ملاقات بھائی دیویندر سے ہال روڈ پر ہوئی۔ میں نے سمجھا کچھ شکوہ شکایت کریں گے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے بے حد خوش ہیں کیونکہ میں انہیں اس چشمے پر اکیلا چھوڑ کر آ گیا تھا۔ انہں نے جیب میں سے ایک تصویر نکالی، جو انہوں نے خود کھینچی تھی۔ اس میں ایک غم زدہ چہرہ ڈبڈباتی آنکھوں سے چشمے میں مچھلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ ''آرٹسٹ کی محبوبہ!''

یہ واقعہ سن کر میرے دوست بشیر احمد جنہیں خود آرٹسٹ ہونے کا فخر ہے، کہنے لگے ''میرا اب بھی خیال ہے کہ دیویندر بھائی اپنی ہر جدت میں حق بجانب تھے۔ اگر ایک آرٹسٹ ایسی باتیں نہ کرے تو پھر آرٹسٹ اور انسان میں فرق ہی کیا ہے''۔

☆☆☆

ریڈیو خریدا ہے!

(آل انڈیا ریڈیو سے معذرت کے ساتھ)

ریڈیو خریدنے سے پہلے انسان ان لوگوں پر رشک کرتا ہے۔ جن کی پاس ریڈیو ہے اور ریڈیو خریدنے کے بعد ان لوگوں پر جن کے پاس ریڈیو نہیں ہے۔ اس انقلاب کی ذمہ داری چند

اشخاص پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً پروگرام مرتب کرنے والے، اپنے احباب، ہمسائے۔ ریڈیو خریدنے سے قبل جب کبھی گلی یا بازار میں سے گذرتے ہوئے آدمی ریڈیو کی آواز سنتا ہے۔ تو وہ سوچتا ہے ''کتنی خوش نصیب ہیں یہ لوگ جو بالا خانہ میں بیٹھ کر دہلی لکھنؤ اور لاہور سے نشر کیے ہوئے گانے یا تقاریر سن رہے ہیں''۔ اور جب وہ خود ریڈیو خرید لیتا ہے اور دو تین روز ریڈیو کا پروگرام سن لیتا ہے تو پھر اس کا جی چاہتا ہے کہ کانوں میں روئی ٹھونس کر کسی ایسی جگہ بھاگ جائے جہاں ریڈیو کی لہروں کا گزر نہ ہو۔ پھر اسے ریڈیو سننے والوں پر رشک نہیں بلکہ رحم آتا ہے اور بعض دفعہ رحم کا جذبہ اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ وہ ہر ایک سننے والے سے بغلگیر ہو کر کہنا چاہتا ہے:۔

کیا جانئے کہ دل پر گزرے ہے میر کیا کیا

تین ماہ کا عرصہ ہوا۔ حماقت کے کسی لمحے میں، میں نے بھی ایک ریڈیو خرید لیا۔ اب یہ حالت ہے کہ ریڈیو سننا تو کجا اس کی طرف دیکھنے کی بھی جرات نہیں ہوتی۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں مجھے ریڈیو کے پروگرام سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ مثلاً پہلے جب میں ریڈیو سے پے در پے دھماکوں کی آوازیں سنتا تھا تو سمجھتا تھا کہ شاید کہیں ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ اب مجھے پتا ہے کہ اگر ایسی آوازیں سنائی دیں تو اس کا مطلب ہے کہ لاہور ریڈیو سٹیشن پر قوالی گائی جا رہی ہے۔ اسی طرح اگر عالم نزع میں ایڑیاں رگڑنے اور گڑگڑانے کوسی آوازیں سنائی دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی بزرگ دم توڑ رہے ہیں، بلکہ یہ کہ دہلی ریڈیو سٹیشن سے ''پکا گانا'' نشر کیا جا رہا ہے۔ اگر بار بار کھڑکی کے کھلنے اور بند ہونے اور بادل کی مصنوعی گرج کی آواز سنائی دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لکھنؤ ریڈیو سٹیشن ڈرامہ ''براڈ کاسٹ'' کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر ایک باریک سی آواز پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کچھ کہتی ہوئی سنائی دے تو ''عورتوں کا پروگرام'' اور اگر تالیوں کے متواتر شور کے درمیان بے شمار چیختی ہوئی آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچیں تو یقیناً یہ بچوں کا پروگرام ہے اور اگر ایسی آوازیں سنائی دیں جن سے کان کا پردا پھٹنے کا احتمال ہو، تو بلاشک یہ دیہاتی پروگرام ہوگا۔

ساتھ ہی اب میں گانے والوں اور گانے والیوں میں اچھی طرح تمیز کر سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ گانے والے عموماً تیسرے شعر یا دوسرے بند پر سر اور تال سے چوکتے ہیں اور گانے والیاں عموماً شروع سے لے کر آخیر تک بغیر سر اور تال کے گا سکتی ہیں۔ گانے والے عموماً غالب کی

غزلیں گا کر سناتے ہیں اور گانے والیاں عموماً جگر یا بہزاد کی۔ صرف دو چیزوں میں گانے والے اور گانے والیاں متفق ہیں۔ اور وہ یہ کہ دونوں صحیح تلفظ کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور دونوں ''پکا گانا'' گانے میں ماہر۔ ''پکا گانا'' سناتے وقت دونوں اس بات کے کوشاں ہوتے ہیں کہ کسی طرح سننے والے کا دم ناک میں آ جائے، چنانچہ ایک چھوٹا سا مصرع جیسے ''میں نہ بولوں گی'' یا ''ہٹو سیاں'' تقریباً پچاس ساٹھ دفعہ اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ سننے والے پر وحشت کا عالم طاری ہو جائے۔ اگر ''میں نہ بولوں گی'' کی رٹ لگائی جائے۔ تو پندرہ منٹ تک سننے والا اس طرح کی آوازیں سنتا ہے۔

میں نہ میں نہ میں نہ نہ نہ نہ نہ

گارے گا۔ گارے گا۔ مارے پادھانہ نہ بولوں گی۔

نہ رے گا۔ سارے ما۔ سارے۔ سارے بولوں گی۔

حتی کہ تنگ آ کر چیخ اٹھتا ہے کہ اگر تو واقعی نہ بولے تو تیری بڑی عنایت ہو۔ اسی طرح ''ہٹو سیاں'' کے دو الفاظ اس طرح بار بار دہرائے جاتے ہیں کہ سننے والا یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یا تو ''سیاں'' بہت ڈھیٹھ ہیں۔ جو اتنی بار کہنے پر نہیں ہٹتے، یا بالکل بہرے ہیں، جنہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔

دوسری بات جو میں ریڈیو پروگرام کے متعلق جانتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ریڈیو کے پروگرام مرتب کرنے والے بہت ستم ظریف واقع ہوئے ہیں۔ پروگرام تیار کرتے وقت کسی سٹیشن کی حق تلفی نہیں کرتے۔ چنانچہ ریڈیو سنتے وقت آپ کسی سٹیشن کی طرف سوئی گھمائیں۔ آپ کو ایک ہی قسم کا گانا سنائی دے گا۔ مثلاً اگر دہلی سے عاشق علی خاں گا رہے ہیں اور لاہور سے معشوق علی خاں، تو ان کے گانوں میں چنداں فرق نہ ہوگا۔ تقریباً وہی طرز اور وہی لے ہوگی اور عین اغلب ہے کہ دونوں ایک ہی غزل گا رہے ہوں۔ دوسرے پروگرام مرتب کرنے والے اتنے حق پسند ہیں کہ گویے ڈھونڈھتے وقت اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ نہ صرف ان گویوں کے گانوں میں مطابقت ہو، بلکہ ان کے ناموں میں بھی۔ چنانچہ اگر دہلی سے منی بائی گا رہی ہے۔ تو لکھنؤ سے منا بائی۔ اگر لاہور سے مس حسنی کا گانا ہے تو لکھنؤ سے حسن لال کا گانا ہوگا۔ اگر دہلی سے امراؤ خاں گاتے ہوئے سنائی دیتے ہیں تو لاہور سے امراضیا بیگم۔

ساتھ ہی اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ہر ایک اسٹیشن سے قریب قریب ایک ہی قسم کے گیت نشر کیے جائیں۔ صرف معمولی جغرافیائی ردوبدل کیا جائے۔ مثلاً اگر لکھنؤ سے یہ گیت گایا جا رہا ہے۔ ''گنگا کے اس پار پریتم'' تو دہلی میں اسے اس طرح گایا جائے۔ ''جمنا کے اس پار پریتم'' اور لاہور پہنچتے پہنچتے وہ گانا۔ ''راوی کے اس پار پریتم'' میں تبدیل ہو جائے۔ مگر پروگرام مرتب کرنے والوں کی ستم ظریفیاں یہاں ہی ختم نہیں ہو جاتیں۔ دوپہر کے وقت وہ آپ کو گراموفون ریکارڈ سنواتے ہیں، اور ایسا کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں، کہ صرف وہی ریکارڈ منتخب کیے جائیں جن کو سن کر سننے والا ریڈیو سیٹ کو توڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ ریکارڈ جو آپ کے بچپن میں مقبول تھے، یا جن کو آپ نے تب سنا تھا جب آپ پرائمری جماعت میں پڑھا کرتے تھے۔ عموماً آپ کی، ضیافت طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ فلمی ریکارڈوں میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے، کہ کسی تازہ فلم کا ریکارڈ ریڈیو پر نہ آنے پائے۔ دوسرے یہ کہ ہفتہ میں ایک ریکارڈ دوبارہ سہ بارہ ضرور سنوایا جائے اور اس طرح سننے والوں کے دل میں ان ریکارڈوں کے برخلاف ایک ایسا نفرت کا جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ ساری عمر ان ریکارڈوں پر لعنت بھیجتے رہا کریں۔

اب رہی تقاریر تو ان کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ جس نے ریڈیو پر تقاریر سنی ہیں، اور ابھی زندہ ہے، اس کی قوت استقلال کی ہر صاحب ذوق کو داد دینی چاہیے۔ ریڈیو پر تقاریر سن کر یا تو انسان کو بے حد ہنسی آتی ہے یا بے حد غصہ، کیونکہ بعض اوقات مقرر اپنے موضوع سے اس قدر لاعلمی کا اظہار کرتا ہے کہ سننے والے کو اس کی بے باکی پر تعجب آتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب ''عراق اور موجودہ پولیٹیکل حالت'' پر تقریر کر رہے ہیں۔ آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ عراق کے حالات پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ مگر آپ کی حیرانی کی کوئی حد نہیں رہتی جب آپ یہ دیکھتے ہیں، کہ پندرہ منٹ میں انہوں نے صرف عراق کا حدود اربعہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح کوئی صاحب اقبال کے فلسفہ حیات پر تقریر فرماتے ہیں مگر کوئی کام کی بات بتانے کے بجائے بے معنی فقرات دہرا دہرا کر آپ کی تضحیک کا باعث بنتے ہیں۔ جیسے ''اقبال کا فلسفہ حیات بہت عمیق ہے۔ بہت گہرا ہے۔ اتنا گہرا ہے کہ ہم تم اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں''۔

اب بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ریڈیو خرید لینا تو آسان بات ہے مگر ریڈیو کا سننا اتنا آسان نہیں کیونکہ اول تو عموماً موسم ہی خراب رہتا ہے۔ اگر موسم خراب نہ بھی ہو تو پروگرام ضرور خراب ہوتا ہے۔ اور اگر موسم اور پروگرام موافق ہوں، تو پھر اپنی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے بہت سے حضرات مصلحت اس میں سمجھتے ہیں کہ ریڈیو خریدا تو جائے مگر اسے سنا نہ جائے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ جس دن آپ ریڈیو خرید کر گھر لاتے ہیں۔ آپ کے واقف کار احباب اور ہمسائے یہ تہیہ کر لیتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت آپ کو تخلیہ میں ریڈیو سننے نہ دیں گے۔ چنانچہ پانچ بجتے ہی آپ کے گھر پر آپ کے واقف کاروں کا جمگھٹا ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی پت وار دھن کا گانا سننے آیا ہے، کوئی رسولن بائی کا ترانہ، کوئی برلن کی خبروں کا شائق ہے اور کوئی بی بی سی کے پروگرام کا عاشق۔ اب پہلے آپ کو ان حضرات کی پان، سگریٹ، سوڈا سے خاطر تواضع کرنا ہے، پھر ہر ایک کے پسند کی چیز سنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ریڈیو ایک ہی وقت میں تمام حضرات کی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا۔ اس لیے آپ کے احباب میں وہ ہنگامہ برپا ہوتا ہے کہ ریڈیو کی آواز اس شور وغل میں خود بخود گم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب 8 بجے دہلی سے منٹو صاحب کا لکھا ہوا ڈرامہ سننا چاہتے ہیں اور شاکر صاحب برلن سے ہندوستانی میں خبریں اور باقر صاحب لاہور سے شمشاد بیگم کا گانا۔ اب سوال یہ ہے کہ کس کو انکار کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں کہ جرمن کی خبریں سراسر بکواس ہیں۔ شکر صاحب کی دہلی سے براڈ کاسٹ کیے گئے ڈراموں کے متعلق یہی رائے ہے اور باقر صاحب سمجھتے ہیں کہ خبروں اور ڈراموں سے شمشاد بیگم کا گانا بدرجہا افضل ہے۔ یہ تکرار پندرہ منٹ تک رہتی ہے اور اس عرصہ میں برلن کی خبریں، منٹو صاحب کا ڈرامہ اور شمشاد بیگم کا گانا ہمیشہ کے لیے فضا میں گم ہو جاتا ہے۔

اور پھر اگر شامت اعمال سے آپ کے احباب اور واقف کاروں میں کسی کو گانے سے مس ہے تو پھر آپ کی بدنصیبی کا کیا کہنا! ادھر گانا شروع ہوا، ادھر انہوں نے سر دھنتا یا میز اور کرسی کو بطور طبلہ استعمال کرنا شروع کیا۔ بعض ہوا میں ہاتھ مار مار کر اپنی خوش ذوقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور بعض آنکھیں بند کر کے مصنوعی وجد کی حالت پیدا کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک دو منٹ تک جاری

رہتا ہے۔اور پھر یکلخت ان میں سے ایک پکار اٹھتا ہے۔ ''بالکل خراب کر دیا۔اُف کمبخت بالکل بے سرا ہو گیا''۔اس پر اپنی عجیب وغریب حرکات بند کر کے گانے والے پر لعن طعن شروع کر دیتے ہیں۔کوئی کہتا۔کمبخت نے بھیم پلاسی کا ستیاناس کر دیا۔کوئی گویا ہوتا ہے، یہ سب طبلے والے کا قصور ہے۔کسی کی دانست میں یہ سارنگی والے کی خطا ہے اور باقی وقت میں یہ اس مسئلے پر بحث کی کاتی ہے کہ آیا وہ شروع سی بھیم پلاسی گا رہا تھا۔یا ''سندھورا'' اسی طرح ہر ایک گانے کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا جاتا ہے۔اور سر اور تال کے معاملے میں دوسروں سے اختلاف ظاہر کر کے اپنی فضیلت قائم کی جاتی ہے۔ ''آہا مالکونس تین تال میں کیا لطف دے رہا ہے''۔اس پر دوسرا فوراً پکار اٹھتا ہے۔ ''اجی نہیں یہ تو چارتال ہے''۔اس بار، کا تصفیہ کرنے کے لیے آیا یہ تین تال ہے یا چارتال، رات گئے تک مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ چند احباب فطرتاً ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔وہ جب تک پروگرام کو الف سے یے تک نہ سن لیں، اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔اپ ان کو گھر سے نکالنے کے لیے بے شک کتنے بہانے بنائیں۔مثلاً اب تو نیند آ رہی ہے۔اب باقی کے پروگرام میں کوئی اچھا گویا یا مقرر نہیں۔اب تو گانا سنتے سنتے طبیعت اکتا گئی'' مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔حتیٰ کہ آپ کو فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ ان کے سونے کا انتظام بھی آپ کو ہی کرنا پڑے گا۔

آخر میں صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ ریڈیو کی آواز ڈھول کی آواز کی طرح صرف دور سے سہانی معلوم ہوتی ہے۔اس لیے اگر آپ کو ریڈیو خریدنے کا شوق ہے تو بے شک خریدیں۔مگر اس کو اپنے ہمسائے کی گھر پر رکھ کر سنیں۔ورنہ خاک لطف نہ آئے گا۔اور کوفت مفت میں ہوگی۔

☆☆☆

چینی شاعری

چینی شاعری پر قلم اٹھانے سے پہلے میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں چینی نہیں جانتا۔مگر اس بات کا مجھے چنداں افسوس نہیں، کیونکہ اگر میں چینی نہیں جانتا، تو آپ کب جانتے ہیں؟ چینی تمدن، چینی لٹریچر، چینی تہذیب سے میری واقفیت صرف دو چیزوں کی وساطت سے

ہوئی ہے۔ان میں سے ایک تو ہے چینی کا پیالہ جو کہ میں نے پچھلے سال آل انڈیا نمائش سے خریدا تھا۔اور دوسری ہے ایک چینی تصویر جس میں کہ ایک چینی شہزادی (میں اسی شہزادی ہی کہوں گا)ایک کتے کی طرف انکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ بہر حال آپ کو ان چیزوں سے کیا مطلب؟ آپ تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ چین کا سب سے بڑا شاعر کون ہےاور چین میں اس وقت کتنے شاعر ہیں۔تو لیجئے چین کا سب سے بڑا شاعر شین شی شک ہے اور چین میں اس وقت ہزاروں شاعر ہیں۔ بلا مبالغہ چین کا بچہ بچہ شعر کہتا اور سمجھتا ہے۔اگر میں ان تمام شاعروں کے نام لکھ دوں،تو آپ یقیناً حیران ہو جائیں اور اگر میں ان کی مطبوعات کی فہرست بھی شامل کر دوں تو آپ کی حیرانی پریشانی میں تبدیل ہو جائے۔مگر میر مقصد آپ کو حیران یا پریشان کرنا نہیں۔میرا مطلب تو آپ کو چینی شاعری سے تعارف کرانا ہے۔چینی شاعروں کے نام یاد کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ مجھے یاد ہے۔اور وہ یہ ہے کہ آپ ان چھ سات لفظوں کو یاد کرلیں۔پانگ شانگ ٹانگ۔بک۔تین۔شین۔اب انہی لفظوں کے ہیر پھیر اور امتزاج سے چین کے ہر ایک چھوٹے اور بڑے شاعر کا نام بن سکتا ہے۔مثلاً اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ چین کا سب بڑا رومانی شاعر کون ہے؟ تو آپ فوراً کہہ دیجئے ٹین بک بک۔چین کا سب سے بڑا انقلابی شاعر کون ہے؟شین ٹانگ ٹانگ۔اقتصادی شاعر،شک ٹین ٹانگ۔اچھا آپ کی ایک مشکل تو حل ہوگئی۔اب آگے چلئے۔

یقیناً آپ اس بات کے جاننے کے خواہش مند ہیں کہ چینی شاعر،کن چیزوں کو شاعری کو موضوع بناتے ہیں اور ان کے کلام کی کیا خصوصیات ہیں۔تو سب سے پہلی بات جو کہ آپ کو سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ چینی شاعر عموماً پھولوں،جھیلوں،سمندروں،اور سانپوں کے متعلق لکھتے ہیں۔مثلاً شین ٹین ٹانگ کو ہی لیجئے۔اپنے تازہ مجموعۂ کلام میں اس نے سوائے سانپوں کے کسی اور چیز کا ذکر تک نہیں کیا،مثال کے طور پر اس نظم کو لیجئے۔

”آہا جھیل کے سنہری پانی پر سانپ ناچ رہا ہے۔

کیا دلکش نظارہ ہے۔

کاش،کہ ہم سب سانپ ہوتے“۔

مگر آپ یہ نہ سمجھئے کہ شین ٹین ٹانگ سوائے سانپوں کے کسی اور چیز پر لکھ ہی نہیں سکتا۔اس

نے مینڈکوں، چوہوں اور مچھروں پر بھی لا تعداد نظمیں لکھیں ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دوسری بات چینی شاعری کے متعلق یہ ہے کہ چینی شاعر عجیب وغریب استعارے، نادرالوجود ترکیبیں اور نہایت دلکش تشبیہیں استعمال کرتے ہیں، مثلاً ٹین شانگ ایک جگہ لکھتا ہے:

میری محبوبہ کی آنکھیں
سبز ہیں
شفتالو کے پتوں کی طرح
اس کے دانت
تیز ہیں
تلوار کی طرح
اور آندھی کی طرح
اس کے بال سیاہ ہیں
اور قد دیوار چین سے اونچا ہے

آپ نے کالی، نیلی اور پیلی آنکھیں تو دیکھی اور سنی ہوں گی، مگر سبز آنکھیں صرف شین شانگ کے کلام ہی میں پائی جاتی ہیں اور محبوبہ کے دانتوں کو کس چیز سے تشبیہہ دی ہے؟ جزاک اللہ صاحب! یہ چین ہے چین، اور سنیے، پانگ پانگ ٹین لکھتا ہے:

سورج کی ٹھنڈی کرنیں مجھے بے چین کر رہی ہیں۔
خزاں آ گئی۔
طرح طرح کے پھول کھلے
بلبل گا رہی ہے مگر اف!
مجھے کس قدر بھوک لگ رہی ہے

حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ چین میں یا یوں کہیے، چینی شاعری میں ہر ایک چیز ممکن ہے۔ اور یہی تو چینی شاعری کی خوبی ہے۔ ہمارے ہاں بہار میں پھول کھلتے ہیں۔ مگر چینی شاعروں کا تخیل دیکھئے کہ خزاں میں پھول کھلوا دیئے۔ اور پھر سورج کی ٹھنڈی کرنیں! قلم توڑ کے رکھ دیا ہے۔

چینی شاعر پھولوں کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں۔ایک شاعر لکھتا ہے:

مجھے نیلوفر کے پھول لا دو۔
اور ہاں، نرگس، چنبیلی اور گلاب بھی
کیا تم نے نہیں سنا۔
مجھے نیلوفر کے پھول درکار ہیں۔
کہیں سوسن نہ لے آنا۔ بے وقوف!
مجھے چاہئیں، صرف نرگس، چنبیلی اور گلاب۔
اچھا۔ٹھہرو۔آج مت لانا۔
مجھے آج زکام ہے۔

آخری مصرع میں شاعر نے حقیقت نگاری کو جس معراج پر پہنچایا ہے، وہ اس کا ہی حصہ ہے۔کاش! ہمارے نوجوان ہندوستانی شاعر کچھ چینی شاعروں سے سیکھتے۔ذرا غور کیجئے شاعر پھول منگوانا چاہتا ہے۔مگر یک لخت اس کو خیال آتا ہے کہ اسے زکام ہے۔پھر پھول منگوانے کا فائدہ ہی کیا۔''پھر کبھی سہی'' شاعر کہتا ہے۔اور نظم کو اس رنگین مصرع پر کہ 'مجھے آج زکام ہے''۔ختم کر دیتا ہے۔

اظہار عشق میں چینی شاعروں کا کوئی ہم پلہ نہیں۔وہ دقیق سے دقیق نفسیاتی مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر جاتے ہیں، اس طرح کہ بے چارے ہندوستانی شاعر منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔مثلاً شین ٹانگ شک کو لیجئے۔لکھتا ہے:

کل میں نے خودکشی کرنے کی ٹھانی
میں نے زہر خریدا۔
میں سمندر کے کنارے پر گیا۔
میں نے اپنے کپڑوں پر پٹرول ڈالا۔
میں زہر کی گولی کھا کر
اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر
سمندر میں کود جانا چاہتا تھا

کہ معاً مجھے خیال آیا

کہ وہ مٹھائی جو کہ تمہاری بہن نے تم کو بھیجی تھی

میرے مرنے کے بعد

تم اکیلی ہی کھا جاؤ گی

میں نے خودکشی کا خیال ترک کر دیا۔

اور سیدھا گھر چلا آیا۔

کیوں صاحب! دیکھا آپ نے چینی شاعری کا کمال! شاعر خودکشی پر آمادہ تھا۔ اس نے بیک وقت تین مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا مگر اچانک جب کہ وہ دنیا کی ہر ایک چیز سے کنارہ کشی کر کے زہر کھا کر کپڑوں کو آگ لگا کر سمندر میں کودنا چاہتا تھا۔ اسے ایک ایسی چیز یاد آئی، جس نے اس کے دماغ میں عجیب ہیجان پیدا کر دیا۔

مٹھائی! اور پھر اس پر یہ پریشان کن خیال کہ اس کی بیوی اکیلی کھا جائے گی، یہ ہے نفسیاتی شاعری۔

چینی شاعر انسانی دماغ کی عمیق گہرائیوں میں جس خوبی سے اتر سکتا ہے، وہ صرف نفسیات کے ماہر ہی جان سکتے ہیں۔

اب صرف ایک اور بات آپ کو سمجھ لینی چاہیے۔ اور پھر آپ چینی شاعری کو مکمل طور پر سمجھ جائیں گے۔ وہ بات یہ ہے کہ چینی شاعر بعض دفعہ اپنے شعروں میں اور کئی دفعہ اپنی غزلوں میں ہندوستانی شاعروں کی تخیل کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً پو ہا نگ لی ایک جگہ کہتا ہے:

اے میرے محبوب۔ تمہاری گلی میں میں آنا کس طرح چھوڑ دوں کیونکہ یہ تو ایک عمر بھر کی عادت ہو چکی ہے۔

اب آپ ہیں جنہوں نے کلامِ غالب کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ شعر حضرت غالب کے مشہور شعر

چھٹتے چھٹتے ہی چھٹے کا اس کی گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

کا مماثل ہے۔ ایک اور جگہ یہی شاعر لکھتا ہے:

''صرف وہی شخص نیند کا لطف اٹھا سکتا ہے جس کے بازوؤں پر تمہاری زلفیں پریشان ہو جاتی ہیں''۔

اب یہ شعر آپ کو غالب کے مشہور شعر

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
اس کے بازو پر تیری زلفیں پریشان ہو گئیں

کی یاد دلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پو ہانگ لی غالب کی شاعری سے نہایت متاثر ہوا ہے۔ کم بخت ٹانگ ٹانگ نے علامہ اقبال کی مشہور نظم ''اٹھو میری دنیا کو جگا دو'' کا پورا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ لکھتا ہے:

''کہ جس کھیت سے کاشتکار کو روٹی نہیں ملتی، اس کے ہر ایک خوشہ گندم کو جلا دو''۔

چین کا مشہور شاعر بھک بھک جو کہ شاعر ہونے کے علاوہ ظریف بھی ہے۔ اپنی ملک کے نوجوانوں کی مغرب پرستی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے:

''افسوس کہ چین کے نوجوان مغرب کے دلدادہ ہو گئے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ مغرب میں تمام برتن بلور کے ہوتے ہیں اور ہمارے یہاں سب چینی کے''۔

غور کیجئے۔ بھک بھک کا تخیل علامہ اقبال کے تخیل کے کس قدر نزدیک پرواز کر رہا ہے۔ جو بات بھک بھک نے آج کہی۔ وہ ہندوستان کے شاعر نے بیس برس پہلے ہمارے ذہن نشین کرادی۔

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
وہاں ...... کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

مگر اب زیادہ مثالیں دینے کا کیا فائدہ۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہیں اور اگر آپ نہیں سمجھے۔ تو آپ میری کتاب ''چینی شاعری'' پڑھئے۔

☆☆☆

بڑے آدمی

اصغران آدمیوں سے ہے جو بن پئے بہک جاتے ہیں۔ یعنی جن پر بیٹھے بیٹھے جنوں طاری ہو جاتا ہے اور جو واہی تباہی بکنا شروع کر دیتے ہیں۔ میرے احباب کا خیال ہے کہ اس کے دماغ کی ایک آدھ چول ڈھیلی ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس کے دماغ کی تمام چولیں ڈھیلی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض دفعہ وہ عالم دیوانگی میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ فرزانے منہ تکتے رہے جاتے ہیں۔ مگر بسا اوقات اس کی گفتگو میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ ابھی کل کی بات ہے۔ وہ جونہی میرے کمرے میں داخل ہوا، اس نے بلند قہقہہ لگایا، اور کرسی پر دراز ہو کر اپنے آپ سے اس طرح باتیں کرنے لگا۔

''مرنے سے پہلے میں کچھ عرصہ کے لیے بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں۔ میں ضرور بڑا آدمی بنوں گا۔ میں بڑا آدمی بن کر رہوں گا''۔ میں نے چونک کر کہا۔ ''تم بڑا آدمی بننا چاہتے ہو؟ ایک سوشلسٹ اور ادیب کو بڑا آدمی بننے کا شوق کس طرح چرایا''؟ اصغر نے دیوانہ وار چھت کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ادب اور سوشلزم بہت اچھی چیزیں ہیں۔ مگر کبھی کبھی انسان ان سے بھی اکتا جاتا ہے۔ تنگدستی اور فاقہ مستی میں واقعی لذت ہے۔ مگر بڑا آدمی بننے میں اس سے بھی زیادہ مزا ہے''۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تم مذاق تو نہیں کر رہے۔ تم بڑے آدمیوں سے ہمیشہ نفرت کرتے رہے ہو''۔

اصغر نے شرارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ آج سے میں بڑے آدمیوں کا مداح بن گیا ہوں اور اسی انقلاب کی وجہ ایک بڑا آدمی ہے۔ جس کی تقریر میں ابھی ابھی سن کر آیا ہوں''۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ کون بڑا آدمی تھا۔ جس پر تمہارے جیسا کافر ایمان لے آیا''۔

اصغر:۔ ان کا نام نہیں بتاؤں گا۔ وہ چمڑے کے سب سے بڑے سوداگر ہیں۔ پبلک ہال میں اقبال کی وفات کی تیسری برسی منائی جا رہی تھی اور آپ اس مجلس کے صدر تھے۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ آپ اقبال کے عاشق ہیں اور آپ نے اقبال کی تمام تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے خاص کر ''بانگ قضا'' کو آپ نے تین بار پڑھا اور ''ضرب کریم'' تو آپ کو ازبر ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے چند اشعار پڑھے۔ جن میں سے دو یہ تھے۔

موت کا ایک دن مقرر ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

جس وقت آپ نے یہ دو اشعار اقبال سے منسوب کیے۔ میں اسی وقت ان کی لیاقت اور عظمت کا قائل ہو گیا۔ میں نے سوچا۔ کتنا فرق ہے۔ مجھ جیسے رذیل ادیب اور اس چمڑے کے سوداگر میں۔ اگر بالفرض محال مجھے اس مجلس کی صدارت سونپی جاتی تو مجھے کتنی کاوش کرنا پڑتی۔ اقبال کی تصنیفات کی ورق گردانی کرتا۔ اقبال کے کلام پر لکھے ہوئے مقالات پڑھتا اور اس کے باوجود جب میں شاعر مشرق کے متعلق کچھ کہنے کو کھڑا ہوتا۔ تو ڈرتے اور جھجکتے ہوئے شاید ہی چند فقرات زبان پر لاتا اور یہاں ہمارے بڑے آدمی کس شان بے نیازی سے فرما گئے کہ وہ اقبال کے عاشق ہیں۔

میں: غالباً ان کا مطلب تھا کہ وہ اقبال کے دشمن ہیں۔ کیونکہ اگر اقبال کے چند اس قماش کے اور عشاق پیدا ہو جائیں تو شاید علامہ کو قبر میں چین سے سونا دوبھر ہو جائے۔

اصغر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بڑے آدمیوں کی سراسر توہین ہے کیونکہ بڑے آدمی نہ ہوں تو ہماری کوئی مجلس منعقد ہی نہ ہو سکے۔ بھلا تم ہی بتاؤ۔ کہ اگر تمہارے جیسے کسی نااہل کو کسی ادبی مجلس کا صدر بنایا جائے تو کتنے آدمی حال کے اندر تشریف لائیں''۔

میں نے ہنس کر کہا۔ میرا خیال ہے سوائے تمہارے اور کوئی نہ آئے۔

اصغر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس یہی امر بڑے آدمی کی فضیلت کو ثابت کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے۔ پچھلے سال و بنگال سے ایک بہت بڑے سائنس دان لاہور تشریف لائے۔ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے ایک مجلس منعقد کی گئی جس کے صدر ایک جج بنائے گئے۔ صاحب صدر نے معزز مہمان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ علم قانون کے طالب علم ہیں، تاہم انہیں سائنس سے شغف ہے اور گو وہ سائنس کے متعلق بہت سی باتیں جو انہوں نے سکول میں پڑھیں تھیں، بھول چکی ہیں، تاہم انہیں یاد ہے کہ پانی کن گیسوں سے مل کر بنتا ہے۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ اگر دو حصے نائٹروجن اور ایک حصہ ہائیڈروجن کو ملا دیا جائے۔ تو پانی تیار ہو جاتا ہے۔ سامعین میں سے کسی گستاخ لڑکے نے پکار کر کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے۔ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن''۔ مگر صاحب صدر اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ اور کہنے لگے آپ مجھے اتنا سادہ لوح نہیں سمجھیں۔ کم از کم مجھے واٹر (WATER) کا فارمولا تو یاد ہے''۔

میں نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔تو تم اس قسم کی باتیں بنانے کے لیے بڑا آدمی بننا چاہتے ہو؟
اصغر نے کہا۔نہیں۔اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔
میں نے پوچھا مثلاً

اصغر: یہ کہ بڑے آدمی کو سوائے دو باتوں کے اور کسی قسم کا فکر نہیں ہوتا۔اول یہ کہ کیا اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ کیا اس کے کتے نے پیٹ بھر کر کھنا کھا لیا ہے؟ کیونکہ اس کے خیال میں دنیا میں صرف دو جاندار بستے ہیں۔وہ اور اس کا کتا۔اس کے علاوہ بڑے آدمیوں میں یہ خوبی ہے کہ وہ دماغ کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں کیونکہ نہ انہیں کچھ سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی وہ کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس سوچنے کے لیے متعدد ”دماغی قلی“ ہوتے ہیں۔ان میں سے کوئی ان کے لیے مضمون لکھتا ہے۔کوئی ان کی تقریر تیار کرتا ہے اور کوئی انہیں مہینا کی تاریخ، ہفتے کا دن، ان کے احباب کے فون نمبر، ان کے لڑکے لڑکیوں کی عمر بتانے کو مستعد رہتا ہے۔بڑے آدمیوں کو علم و ادب سے چنداں سروکار نہیں ہوتا۔اس لیے ان کی بلا سے ادیب مریں یا جئیں۔کیونکہ انکی حیات اور ممات ان کے لیے یکساں ہیں۔

میں: تم زیادتی کر رہے ہو۔بڑے آدمی ہی تو ہیں جو ادب کی سرپرستی کرتے ہیں، جو رسائل خریدتے ہیں، نئی کتابیں پڑھتے ہیں، اور جن کے ہاں لائبریریاں ہوتی ہیں۔“

اصغر: بڑے آدمی رسائل خریدتے ہیں۔مگر پڑھنے کے لیے نہیں۔بلکہ میز کے اوپر یا نیچے پھینکنے کے لیے۔وہ کتابیں خریدتے ہیں۔تصاویر دیکھنے کے لیے اور لائبریریاں بناتے ہیں نمائش کے لیے۔ان کی ادبی واقفیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی کتاب سرورق سے آگے کھول کر نہیں دیکھی اور بیشتر کتب ان کی لائبریری میں ایسی بھی ملتی ہیں جن کے انہوں نے اوراق تک نہیں کاٹے۔اب رہی ان کی آرٹ کی سرپرستی۔جہاں تک شاعری، موسیقی، تصویرکشی یا سنگ تراشی کا تعلق ہے بڑے آدمی ان چہار سے تقریباً کورے ہوتے ہیں۔ہاں انہیں اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ آرٹ کو نہیں سمجھتے، وہ آرٹسٹوں کو جانتے ہیں۔انہیں بے شک یہ پتا نہ ہو کہ مالکونس دن کے وقت گایا جاتا ہے یا رات کو مگر وہ بائی وحیدن یا مس زہرہ جان کو ضرور جانتے ہوں گے۔وہ چاہے یہ نہ جانتے ہوں کہ کتھا کلی کس ”ناچ“ کا نام ہے مگر وہ اودے شنکر سے ضرور روشناس ہوں گے کیوں کہ پچھلی دفعہ جب بائی وحیدن ان کے شہر میں آئی تھیں تو انہوں نے

اسے کھانے پر مدعو کیا تھا یا جس وقت اودے شنکر کا کسی تھیٹر میں ناچ ہوا تھا تو وہ اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔ تصویر کشی وہ اتنی سمجھتے ہیں کہ ہر وہ تصویر جس میں کوئی خوبصورت عورت مسکرا رہی ہے، تصویر کہلانے کے قابل ہے، باقی سب بکواس ہے۔

میں: تم تو آج بڑے آدمیوں کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے ہو۔ میں سمجھتا ہوں تم مبالغہ آمیزی اور دروغ گوئی سے کام لے رہے ہو؟۔

اصغر: شاید ایسا ہی ہو۔ مگر ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بڑے آدمیوں کی تقریباً ہر بات رسمی اور غیر قدرتی کیوں ہوتی ہے۔ ان کی ملاقاتیں، ان کے آداب و اخلاق، ان کی محبت کرنے کے طریقے، ان کا کسی چیز کی تعریف کرنے کا ڈھنگ، سب تصنع اور بناوٹ سے کیوں پر ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے اظہار محبت کرتے ہیں تو لفظ ''خوبصورت'' کا بے دریغ استعمال کرنے میں انہیں ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ ''میں کہتا ہوں مجھے تمہاری خوبصورت آنکھوں کی قسم، تمہارے خوبصورت ٹخنوں کی قسم، تمہاری خوبصورت کہنی کی قسم''۔ اگر وہ کسی فلم کی تعریف کرتے ہیں تو ان کی تعریف کچھ اس قسم کی ہوتی ہے ''میرے خیال میں یہ فلم نہایت شاندار ہے۔ اس سے پہلے میں نے ایک فلم دیکھی تھی، وہ بھی نہایت شاندار تھی، ایک اور فلم آ رہی ہے، وہ بھی نہایت شاندار ہو گی''۔ ان کے خیال میں ہر ایک ناول ''نہایت دلچسپ'' ہوتا ہے۔ ہر ایک ایکٹرس ''غضب'' کرتی ہے۔

میں: بس یہی یا ابھی اور کچھ باقی ہے۔

اصغر: صرف ایک بات۔ اور وہ یہ کہ بڑے آدمیوں کو دوسروں کے اخلاق بگڑنے کا ہمیشہ کیوں خدشہ لگا رہتا ہے؟ خصوصاً نوجوانوں کے اخلاق کا، وہ نوجوانوں کو ناول نہیں پڑھنے دیتے، کیونکہ اس سے ان کے اخلاق بگڑنے کا سخت خطرہ ہے۔ کسی نوجوان لڑکے کو کسی نوجوان لڑکی سے کھل کر بات نہیں کرنے دیتے، کیونکہ ان دونوں کے چال چلن بگڑنے کا خدشہ ہے۔ اگر کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو ساری عمر اسے معاف نہیں کرتے، اور خود تین چھوڑ چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ محلے کے ہر غریب آدمی کی خوبصورت عورت پر آنکھ رکھتے ہیں، اپنی لڑکی کو کھلی اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہمسائے کے لڑکے سے راز و نیاز بڑھائے اس کے ساتھ ٹینس کھیلے۔ سیر کو جائے، اپنی عورت کو منع نہیں کرتے کہ وہ کیوں اغیار کے ساتھ

سینمایا ناچ گھر جاتی ہے اور خود اغیار کی عورتوں کے ساتھ سینمایا ناچ گھر جانے میں تامل نہیں کرتے۔ٹی پارٹیوں میں نوجوان لڑکیوں کو اپنے پہلو میں بٹھا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے ،خوابصورت لڑکیوں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں، جھوٹ موٹ بیمار پڑ کر خوبصورت نرسوں سے سارادن چھکتے ہیں۔اور......

میں : بکواس بند کرو۔ورنہ مجھے پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ کوفون کرنا پڑے گا۔

اصغر نے میرا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔اف مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ بھی بڑے آدمی ہیں۔ معاف کیجئے گا۔سخت غلطی ہوئی۔

میں نے کہا بڑا اور چھوٹا اضافی اصطلاحیں ہیں۔ممکن ہے کہ ہزاروں لوگ تم سے بڑے ہوں،مگر یہ بھی ممکن ہے ہزاروں لوگوں سے تم بڑے ہو۔اس لیے بڑے آدمیوں کی شان میں جو ہرزہ سرائی تم نے کی ہے،وہ تم پر بھی عائد ہوسکتی ہے۔

اصغر: میں بڑا آدمی! ناممکن! جس شخص کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔اسے اپنے آپ کو بڑا آدمی کہنے کا کوئی حق نہیں۔

میں : درست اور بجا مگر ایسے شخص کو بڑے آدمیوں کو گالیاں دینے کا کیا حق ہے؟

اصغر: یہی کہ وہ خود بڑا آدمی نہیں!

☆☆☆

انتساب

میرے دوست مسٹر کرشن چندر نے اپنی نئی کتاب ''ہوائی قلعے'' کا انتساب ان عجیب الفاظ میں کیا ہے۔''اس دیوانے کتے کے نام جس نے مجھے متھرا میں کاٹ کھایا''۔جہاں تک میرا خیال ہے،انتساب اس شخص سے کیا جاتا ہے۔جس سے مصنف کو عقیدت ہو۔مثلاً رشتے دار، احباب وغیرہ۔کرشن چندر نے دیوانے کتے سے اپنی کتاب منسوب کر کے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے کئی اور دوستوں کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ایک ذی عقل کتے سے محبت اور عقیدت ہوسکتی ہے،مگر دیوانے کتے سے راہ ورسم بڑھاتے ہوئے میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا۔سوچتا ہوں کہ شاید یہ انتساب کرشن چندر کو ان دنوں سوجھا ہوگا جب کہ دیوانے کتے نے ابھی ابھی انہیں کاٹا

تھا اور وہ اس قسم کے شعر گنگنایا کرتے تھے۔

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ جی چاہتا ہے یا رب
میرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

یا شاید اس انتساب کی تہہ میں کوئی اور راز پوشیدہ ہے کیونکہ ان کے مضمون ''مجھے کتے نے کاٹا'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی دفعہ جب انہیں ایک دیوانے کتے نے لاہور میں کاٹا تھا تو انہیں میو ہسپتال میں ٹیکہ لگوانے کے دوران میں ایک شوخ اور چلبلی قسم کی اینگلو انڈین نرس سے جان پہچان بڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اور شاید یہی بات اس دفعہ ہوئی ہو ورنہ ایک دیوانے کتے کا اتنے پر جوش طریقہ سے شکریہ ادا کرنے کا کیا مطلب۔ مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر یہ بات دیوانے کتوں کے گوش گزار ہو گئی تو ان میں سے ہر ایک اس امید پر کہ کرشن چندر اپنی نئی کتاب کا انتساب اس کے نام کریں گے، ان کو کاٹنے کے لیے دوڑے گا۔ اور عین اغلب ہے کہ آئندہ جب وہ لکھنو ریڈیو اسٹیشن سے باہر تشریف لائیں تو آپ کی پیش قدمی کے لیے باہر دیوانے کتوں کا ایک ہجوم کھڑا ہو اور اپ کو متعدد کتب ان ''دیوانوں'' کے نام منسوب کرنی پڑیں جنہوں نے آپ کو لاہور، لکھنؤ اور بمبئی میں کاٹ کھایا۔ مگر اس انتساب کی ایک اور شرح بھی کی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ کرشن چندر کو دیوانے آدمیوں اور دیوانے کتوں سے ایک گونہ محبت ہے۔ اپنے دلچسپ مضمون ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا''۔

اور ''مجھے کتے نے کاٹا'' میں فرماتے ہیں:۔

''خود اپنی زندگی کے ایسے لمحے گن سکتا ہوں، جب میں نے اپنے آپ کو بالکل پاگل متصور کیا ہے''۔

دیوانگی کی خواہش صرف کرشن چندر پر ہی موقوف نہیں۔ غالب مرحوم نے کئی جگہ اس جذبہ کا اظہار کیا ہے مثلاً

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مگر اس ساری منطق کے باوجود ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو اور انھوں نے یہ انتساب اس لیے کیا ہو کہ اس میں اچھوتا پن ہے۔ بیچارے ادبا کی مجبوریاں، لاچاریاں۔

آج کل ہر ایک آدمی ان سے توقع رکھتا ہے، کہ وہ ہر چیز میں اجنبیت، رومانیت اور شعریت پیدا کریں۔ چنانچہ جو ادیب اپنی کتاب کا انتساب سیدھے سادہ الفاظ میں کرتا ہے، اس کو متفقہ رائے سے دقیانوس، تنگ نظر اور ضعیف الاعتقاد قرار دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ادیب نے اپنے افسانوں کے مجموعے کا انتساب اس طرح کیا ہے:۔

''والدہ ماجدہ کی خدمت میں یہ ہدیہ ''عقیدت'' تو ہماری مایوسی، غم اور غصے کی انتہا تک جا پہنچتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ والدہ ماجدہ کی خدمت میں عشقیہ افسانوں کو پیش کرنا ناقابل تلافی گناہ ہے، بلکہ اس لیے کہ ہم اس ادیب سے اس سے بہتر انتساب کی امید رکھتے تھے۔ ہمیں اس شخص کی سادہ لوحی پر بے حد ہنسی آتی ہے، کہ اپنے افسانوں میں اس نے اظہار عشق تو زہرہ، بلقیس اور بتول سے کیا اور جب انتساب کرنے کا وقت آیا تو وہ ان سب کو فراموش کر کے والدہ ماجدہ کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ چنانچہ ہم خیال کرتے ہیں کہ اس نے والدہ ماجدہ کی مسرت پر ہماری امیدوں کو قربان کر دیا۔

اس طرح ایک اور افسانہ نویس نے اپنی پہلے کتاب اپنے مرحوم والدین کے نام منسوب کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ مرحوم ماں باپ کو اس انتساب سے کوئی مسرت نہیں ہو سکتی، وہ تو خوشی اور غم کے جذبات سے بالاتر ہیں اور نہ ہی ایسا انتساب ہماری مسرت کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ یہ عامیانہ ہے۔ پھر اس قسم کے جذباتی انتساب کیوں نہ ترک کیے جائیں، اور کیوں نہ اس قسم کی قرار داد پاس کی جائے کہ جب تک مصنف کے زندہ دوست اور رشتے دار موجود ہیں، وہ انتساب کے معاملے میں قبرستان کا رخ نہیں کرے گا۔

مگر غیر عامیانہ کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ایسے انتساب کیے جائیں، جن کا نہ سر ہو نہ پیر۔ بعض ادباء ''ٹیگوریت'' سے متاثر ہو کر نہایت مضحکہ خیز انتساب ایجاد کرتے ہیں۔ مثلاً اس بادل کے نام جو گرجتا اور برستا ہوا میری چھت پر سے گزرا اور نہ معلوم کدھر چلا گیا''۔ یا ''چاند کی ان

سنہری کرنوں کے نام جن کا روپہلی عکس مجھے اکثر مبہوت بنا دیتا ہے''۔ یا ''ستاروں کے نام''، یا ''ستاروں سے آگے جو جہاں اور بھی ہیں اور جن کا ذکر علامہ اقبال نے ایک شعر میں کیا ہے، ان کے نام''۔

بعض مصنف مہمل قسم کے انتساب رائج کرنے کے حق میں ہیں۔ ان کا انتساب کسی حالت میں معمایا پہیلی سے کم نہیں ہوتا۔ مثلاً ''ل'' کے نام۔ اب پڑھنے والا سارا دن سر دردی کرتا رہے، کہ یہ حضرت ''ل'' کون ہیں، شاید یہ لطیف احمد ہیں یا للت کمار، لاڈو رانی ہیں یا لاڈلی بیگم اور ادھر عین ممکن ہے کہ آنجناب کا ''ل'' سے مطلب اپنا پالتو ''لنگور'' ہی ہو۔ کئی حضرات ان سے بھی ایک قدم آگے جاتے ہیں۔ وہ ''ل'' تک کا حرف بھی نہیں لکھتے بلکہ صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ ''ان کے نام'' اب اس قسم کا سم ضمیر کئی پڑھنے والوں کی پریشانی کا باعث ہوتا ہے، کیونکہ یہ لفظ تمام بنی نوع آدم کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔ اس لیے کیا معلوم کہ آپ کا روئے سخن کس طرف ہے۔

اگر یہی حال رہا..... تو عین ممکن ہے کہ آنے والے زمانے میں اس طرح کے انتساب مروج ہو جائیں۔

(1) انتساب

(بھلا بوجھئے کس کے نام)

(نوٹ) صحیح نام بتانے والے کو اس کتاب کی ایک جلد بلا قیمت پیش کی جائے گی۔

(2) انتساب

(یہ نہیں بتاؤں گا کس کے نام)

اور نیچے باریک قلم میں۔

ع گر قبول افتد رہے عز و شرف

(3) انتساب

???

!!!

بعض شعرا اپنی کتاب کے پہلے متعدد صفحات صرف انتساب کے لیے مخصوص کرتے

ہیں۔مثلاً پہلے صفحہ پر آپ یہ پڑھتے ہیں۔''اعلیٰ حضرت جناب نواب اسد اللہ خاں صاحب نواب کمدوٹ کے نام،جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کا تمام خرچ اپنے ذمہ لیا''۔ دوسرے صفحہ پر افسر الشعراء حضرت خود سر انبالوی کے نام،جنہوں نے میرے ناکارہ تخیل کی دفتاً فوقتاً اصلاح فرمائی۔تیسرے صفحہ پر رائے صاحب منشی متاب سنگھ کے نام جنھوں نے اس کتاب کا سرورق اپنے پریس میں مفت چھاپا۔علیٰ ہذاالقیاس،آپ پندرھویں صفحے پر یہ پڑھتے ہیں۔''علی محمد جلد ساز کے نام جنھوں نے اس کتاب کی جلد سازی کی''۔اس لمبے چوڑے انتساب کے بعد تمہید،پیش لفظ،دیباچہ،شکریہ وغیرہ اور ان کے بعد چند صفحات بچ جائیں،ان پر چند عامیانہ رنگ کی غزلیں یا نظمیں۔

ایسی کتب پڑھ کر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ صرف انتساب کی خاطر لکھی گئی ہیں۔

سب سے اچھا انتساب وہ ہے جو بے ساختہ ہو۔انگلستان کے مشہور مزاح نگار مسٹر وڈ ہاؤس نے اپنے ایک ناول کا (جس کا نام''مرغی خانے میں محبت'' ہے) انتساب اس طرح کیا ہے۔

ٹاؤن اینڈ کے نام

پیارے دوست۔میں اس قسم کے رسمی انتساب کے سخت خلاف ہوں جس میں یہ کہا جاتا ہے''فلاں دوست کے نام جس کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کتاب کبھی معرض وجود میں نہ آتی''۔میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا انتساب مصنف کی کم ہمتی اور بزدلی پر دلالت کرتا ہے۔میں صاف صاف کہوں گا کہ میں نے انتساب کرتے وقت تمہارا نام اس لیے منتخب کیا کیوں کہ تم ہی نے مجھے اس ناول کا پلاٹ بتایا تھا۔

تمہارا وڈ ہاؤس

بعض ادبا انتساب تجویز کرتے وقت محسوس کرتے ہیں،کہ اپنے متعدد احباب میں سے کس کے نام انتساب کیا جائے۔میرے خیال میں اس سوال کا حل یہ ہوگا کہ کتاب کے صفحات کو اپنے دوستوں کی تعداد پر تقسیم کرلیا جائے اور جو جواب آئے۔اتنے صفحے ہر ایک دوست کے نام منسوب کیے جائیں۔مثلاً ایک سے پچیس صفحہ تک افضل کے نام،پچیس سے پچاس تک اختر کے نام اور باقی انور کے نام۔

☆☆☆

نام

(کرشن چندر، حجاب امتیاز علی، منٹو، ایم اسلم سے معذرت کے ساتھ)

میرے دوست کرشن چندر کا قول ہے کہ کتاب لکھنے کی نسبت کتاب کا نام تجویز کرنا زیادہ مشکل ہے۔ ایک عرصہ تک مجھے اس قول کی صداقت کے متعلق شک رہا۔ لیکن جب گذشتہ ہفتہ مجھے ایک کتاب کا نام تجویز کرنے کی ناگہانی مصیبت پیش آئی تو مجھے اپنے دوست پر ایمان لاتے ہی بنی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ایک کتاب کے لیے جتنے خوبصورت نام تجویز ہو سکتے ہیں۔ وہ تو متقدمین نے پہلی ہی اپنا لیے ہیں۔ ''کہکشاں''، ''کارواں''، ''کوثر''، ''نرگس'' اور ''شعلے'' سب کے سب بہت مدت سے کسی نہ کسی سرورق کی زینت بن چکے ہیں۔ اب صرف ''جہنم''۔ ''دھواں'' اور ''چنبیلی'' متاخرین کے لیے باقی رہے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل اچھے ناموں کی نہ صرف کمی ہے بلکہ ایک اچھا خاصہ قحط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ کوئی اچھا نام ان کی زد سے نہ بچے۔ منشی پریم چند کو ہی لیجئے۔ ان کے ہر ایک ناول کے نام میں وہ مقناطیسی کشش ہے کہ انسان ان کی طرف راغب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ''چوگان ہستی''، ''فردوس خیالِ'' جیسے نام ایک خوبصورت شعر کی طرح پڑھنے والے کے دل میں بے ساختہ اتر جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی تقریباً ہر تصنیف کے نام میں وہ جاذبیت ہے کہ ہمیں بے اختیار ان کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' جیسے ناموں میں ایک نغمے کی شیرینی اور متعدد تلواروں کی جھنکار پوشیدہ ہے۔ اب ان کے مقابلے میں ہمارے زندہ شاعروں کی کتابوں کے نام ملاحظہ فرمائیے۔ ''زیروزبر'' ''صبح شام''۔ ''سیاہ وسفید'' ''ایں و آں'' ''شیر وشکر'' شاید انہی ناموں کی پھیکے پن کو دیکھ کر میرے دوست نریندر ناتھ نے ایک دفعہ کہا تھا۔ کہ موجودہ زمانے کے شعرا اگر بجائے ایسے نام ایجاد کرنے کے پرانے ناموں کو تھوڑی بہت تصرف کے ساتھ استعمال کریں، تو مناسب ہوگا۔ مثلاً ''بال جبریل'' کی طرز پر ''بال عزرائیل'' یا ''بال اسرافیل'' یا ''بال ابابیل'' وغیرہ۔ مجھے ان کی اس تجویز سے کلیتاً اتفاق ہے۔ مثلاً حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے نام ''صنوبر کے سائے'' مجھے بہت پسند ہے، گو یہ صحیح ہے کہ میں نے آج تک

صنوبر کا درخت نہیں دیکھا، اور نہ ہی کبھی اس کے سائے میں بیٹھا ہوں۔ اب اگر کوئی صاحب اپنی کتاب کا نام ''کیکر کے سائے'' تجویز کریں تو مجھے از حد مسرت ہوگی کیونکہ پنجاب میں کیکر بکثرت ہوتا ہے اور ہم میں سے تقریباً ہر ایک کو اس کے سائے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس جدت کا یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہر ایک نام کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا مثلاً کیکر کے سائے کے بعد ''شیشم کے سائے'' اور پھر ''شہتوت کے سائے'' اور پھر ''انار کے سائے''۔ اب یہ ظاہر ہی کہ جو شخص صنوبر کے سائے کا مطالعہ کرے گا، یقیناً اس کی خواہش ہوگی کہ اب ''چنار کے سائے'' پڑھوں اور اگر اور کسی بات کے لیے نہیں تو صرف اس امر کے لیے کہ ان دونوں درختوں میں کس کی چھاؤں زیادہ میٹھی اور گھنی ہے۔ نیز مصنفوں کو اپنی نئی کتابوں کے نام تلاش کرنے میں سہولت ہو جائے گی۔ مثلاً کرشن چندر صاحب ''طلسم خیال'' کے بعد ''پرواز خیال'' ''نیرنگ خیال''، ''سمند خیال'' جیسے ناموں کے تحت اپنے تمام افسانوں کے مجموعے شائع کر سکتے ہیں اور ''نظارے'' کے بعد ''شرارے'' شرارے کے بعد غبارے اور ''غبارے'' کے بعد ''طیارے'' نہایت آسانی کے ساتھ معرض وجود میں لا سکتے ہیں۔

آپ کچھ ہی کہیں، کسی کتاب کے لیے آج کل ایک اچھا نام صرف اتفاق سے رکھا جا سکتا ہے۔ جیسے سعادت حسن منٹو نے اپنے ڈراموں کا نام ''آؤ'' رکھ دیا ہے۔ اپنے ڈراموں کے مجموعے کا نام ''آؤ'' رکھ کر منٹو نے نہ ہی صرف انتہائی جرات سے کام لیا ہے، بلکہ ہر ایک مصنف کو نام تجویز کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ بتایا ہے۔ بیشک اب اچھے ناموں کی کمی ہے مگر ابھی اردو زبان میں مصادر کی کمی نہیں اور پھر ہر ایک مصدر سے فعل امر بنانا چنداں مشکل نہیں۔ چنانچہ انہوں نے آنا مصدر سے فعل امر بناتے ہوئے ''آؤ'' سے ابتدا کی ہے۔ اب آپ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ''جاؤ''، ''گاؤ''، ''کھاؤ''، ''لڑو''، ''دوڑو''، ''بھاگو'' وغیرہ متعدد نام سوچ سکتے ہیں۔ ان ناموں میں جہاں سادگی ہے، وہاں دعوت عمل بھی ہے۔ مثلاً پڑھنے والا جب ''بھاگو'' جیسی کتاب کا سرورق پڑھے گا تو کم از کم مصنف کی ایک بات پر تو عمل کرے گا، یعنی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گا۔

دوسرے اس قسم کے نام میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ ''ہوائی قلعے'' کا

سرورق پڑھ کر کوئی شخص غلطی سے یہ سمجھ لے کہ شاید اس کتاب میں ہوائی جنگ کے متعلق کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ ''ہوا میں'' کس طرح قلعے بنانے جائیں اور کس طرح دشمن کو نرغے میں لانا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ''شہر فرانس'' کو جادو یا طلسم کی کتاب تصور کرلے مگر ''آؤ'' کا مطلب سوائے ''آؤ'' کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس کے بعد بھی اگر آپ کو ''آؤ'' جیسا نام ناپسند ہو تو آپ کم از کم اس بات کا اعتراف تو کریں گے کہ ''آؤ'' ایم اسلم کے ''نمستے علیکم'' سے بدرجہا اچھا نام ہے۔ ''آؤ'' جتنا مختصر ہے ''نمستے علیکم'' اتنا ہی بے ڈھب ہے۔ ''آؤ'' میں اچھوتا پن نہ سہی مگر اختصار تو ہے، ''نمستے علیکم'' میں ہندو مسلم اتحاد ہو تو ہو، مگر ترنم اور اختصار نہیں۔

شاید ''نمستے علیکم'' کو دیکھ کر میرے دوست مہندر ناتھ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ اسلم صاحب اس کتاب کا نام ''مسجد و مندر'' رکھ دیتے۔ گو میری دانست میں ''شیخ و برہمن'' زیادہ موزوں رہتا۔ میرے دوست مہندر ناتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہمارے مصنف انگریزی مصنفوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ناولوں کے نام اردو کے اچھے شعروں اور مصرعوں سے اخذ کریں، تو یہ جدت خوب رہے۔ مثلاً ٹامس ہارڈی نے اپنے ایک ناول کا نام (The Under Greenwood Tree) رکھا ہے اور یہ مصرع شیکسپئر کے ایک مشہور گیت کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہارڈی کے ایک اور ناول کا نام (Far From The Madding Crowd) ہے۔ اور یہ مصرع تھامس گرے کی ایک المیہ نظم سے لیا گیا ہے۔ میرے دوست کا خیال ہے کہ اردو ناول نویسوں کو بھی اب اس طرح کے نام رکھنے چاہئیں۔ مثلاً عشق و محبت کی داستانوں کے نام کچھ اس قسم کے ہوں۔ ''عشق پر زور نہیں..... ''، ''عشق نے غالب نکما کر دیا..... ''، ''دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی''۔ جہاں ریحانہ رہتی تھی''۔ اور رنج و غم کے افسانوں کے نام اس طرح کے ہوں۔ ''ہم رونے پہ آ جائیں تو''۔ ''مجھ غمزدہ کو نیند نہ آئی تمام رات''۔ ''تھمتے تھمتے ہی تھمیں گے آنسو'' وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ میں نے ان کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک دوست کی کتاب کا یہ نام تجویز کیا ہے۔ ''شرم تم کو مگر نہیں آتی'' یہ مصرع جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، حضرت غالب کی ایک

غزل سے لیا گیا ہے اور امید کرتا ہوں کہ آپ اس مصرع کی معنوی اور صوری خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میری جدت کی داد دیں گے۔

☆☆☆

رومان کی تلاش

یہ سب رومانی افسانوں اور ناولوں کا قصور تھا، اگر وہ انہیں نہ پڑھتا، تو شاید وہ اس وہم میں مبتلا نہ ہوتا۔ مگر اب تو چوبیس گھنٹے اس کے سر پر یہ خیال سوار رہنے لگا تھا کہ دنیا میں رومان کا فقدان نہیں ہوا، اور اگر وہ کوشش کرے تو اس کی زندگی رنگین اور پر لطف بن سکتی ہے۔ رومانی افسانے پڑھ پڑھ کر اسے یقین آ چلا تھا کہ رومان کسی خاص آدمی یا کسی خاص جگہ کے لیے مخصوص نہیں۔ افریقہ کے ریگستان سے لے کر کشمیر کی وادی تک ہر ایک جگہ رومان سے پُر ہے۔ گاؤں میں اگر حسین چرواہیاں ہیں، تو شہروں میں حسین تیتریاں، اور وادیوں میں سلمیٰ یا ریحانہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔

وہ ان خیالات کے زیر اثر گھر سے رومان کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہ خود چھریرے بدن کا خوبصورت نوجوان تھا، ایم۔ اے تک تعلیم تھی اور اس وقت آل انڈیا ریڈیو میں ایک سو پچیس روپیہ ماہوار پر ملازم تھا۔

ایک ماہ کی چھٹی لے کر جب وہ سری نگر کو جانے والی لاری میں سوار ہوا تو اس کا دل خلاف معمول زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے لاری میں اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ لاری کے ایک کونے میں اسے ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی جس نے دھانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور جس کے دل آویز خدو خال اسے کسی حسین رقاصہ کی یاد دلا رہے تھے۔ لڑکی کے ہمراہ ایک نہایت بدشکل آدمی تھا اس کا نوکر یا خاوند۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، یہ ظاہر تھا۔ کہ اس بدشکل آدمی کے مقابلے میں وہ بدرجہا خوبصورت تھا اور اگر وہ لڑکی بالکل بے وقوف نہ تھی، تو وہ ضرور ہی اس کو اپنے آدمی پر ترجیح دے گی۔ اس نے لڑکی کی طرف گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا، لڑکی نے گھبرا کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس نے اس طرف منہ کیا تو اس نے مسکرا کر پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ جب

لڑکی نے سراٹھایا تو اس نے اپنی نگاہیں ایک بار پھر اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔اس دفعہ نہ جانے لڑکی کو کیا خیال آیا، اس نے نہایت خشم آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔مقابلہ کی تاب نہ لا کر اس نے آنکھیں نیچے کرلیں۔اس کے بعد اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔اس طرح اس کا پہلا رومان ختم ہوا۔مگر اسے چنداں مایوسی نہ ہوئی۔غالباً یہ لڑکی ان جاہل عورتوں میں سے تھی جو فطرتاً غیر رومانی واقعہ ہوتی ہیں، جو اپنے بدصورت اور غریب خاوند کو دیوتا سے کم نہیں سمجھتیں اور جو اس سے کسی حالت میں بھی چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتیں۔

لاری پوری رفتار سے جموں کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔جموں کے بعد لاری نے کشمیر کی حدود میں داخل ہونا تھا۔کشمیر کا خیال اس کے دل میں رہ رہ کر گدگدی پیدا کر رہا تھا۔

کشمیر، یعنی زمین پر جنت کا دوسرا نام۔خوبصورت کشمیری لڑکیاں۔دودھ کی طرح سفید رنگ، سیب کے مانند گال، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، اسے وہ تمام قصے یاد آ گئے جو اس نے کتابوں میں پڑھے تھے۔اس نے فیصلہ کیا کہ وہ راستے میں ضرور کسی ڈاک بنگلے میں رات گزارے گا۔

چنانچہ بانہال کے مقام پر ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔رات کے 11 بجے اس نے بیرے کو آواز دی ''بیرا!'' اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔''دیکھو۔ہمارے لیے ایک خوبصورت کشمیری لڑکی لے آؤ''۔

''خوبصورت کشمیری لڑکی'' بیرے نے حیران ہو کر کہا۔''میں کہاں سے لاؤں حضور؟''۔

''یہیں گرد و نواح سے، میرا مطلب ہے کسی گاؤں سے''۔

''مگر کس طرح؟''۔

''یہی روپے کا لالچ دے کر۔دس روپیہ، پندرہ روپیہ، پچیس روپیہ تک''۔

''مگر صاحب، روپے کے لالچ پر یہاں کون آنے پر تیار ہوگا''۔

''ارے۔ہزاروں غریب عورتیں، جنہیں روپے کی ضرورت ہے''۔

''آپ غلطی پر ہیں۔اس علاقہ کے لوگ اتنے بے غیرت نہیں، کہ اپنی بہو بیٹیاں روپے کے لالچ کی خاطر آپ کے پاس بھیج دیں، اگر انہیں پتا چل جائے کہ آپ اس قسم کے آدمی ہیں۔تو آپ کو زندہ نہ چھوڑیں اور مجھے بھی''۔

''یہ بات ہے''۔اس نے مری ہوئی آواز میں کہا اور پھر ایک خشک ہنسی ہنس کر۔''میں تو

مذاق کرر ہا تھا۔ مجھے سب معلوم ہے''۔

سری نگر پہنچ کر اس نے ایک اچھا سا ہاؤس بوٹ کرائے پر لیا اور دوسرے دن رومان کی تلاش میں چل پڑا۔ میراں کدال کے پاس اس نے تین خوبصورت لڑکیوں کو ایک شکارا کرائے پر لیتے ہوئے دیکھا۔ معاً اس کے دل نے اسے ترغیب دی کہ وہ بھی شکارے میں بیٹھ کر ان کے تعاقب میں جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب اس کا شکارا لڑکیوں کے شکارے کے بالکل قریب پہنچا، تو اس نے ایک رومانی گیت ہلکے ہلکے سروں میں گانا شروع کیا۔ اس کی آواز سن کر تینوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں، اور اس کی نقلیں اتانے لگیں۔ ان میں سے ایک تکیہ کے سہارے بالکل اسی طرح بیٹھ گئی، جس طرح وہ بیٹھا تھا۔ باقی دو کچھ اس طرح کے فقرے چست کرنے لگیں۔ ''واہ کیا گلا پایا ہے، اف کتنا سوز ہے گلے میں!''۔

اس نے گانا بند کر دیا۔ اور لڑکیوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس پر ان میں سے ایک پکار اٹھی۔ ''واہ واہ۔ آپ مسمریزم بھی جانتے ہیں''۔ یہ فقرہ سن کر وہ جھینپ سا گیا اور شکارے والے کو کہنے لگا کہ نہایت تیزی سے شکارے کو آگے لے جائے۔

دوسرے دن شام کے وقت وہ ایک بوڑھے ملاح کے شکارے میں بیٹھ کر ڈل لیک کی جانب گیا۔ راستے میں اس نے ڈرتے ڈرتے بوڑھے میاں سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی یہاں کوئی سیر و تفریح کی جگہ بھی ہے''۔

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''ہزاروں جگہیں ہیں۔ شالا مار باغ، نسیم باغ''۔

''میرا یہ مطلب نہیں۔ میرا مطلب کچھ اور ہے''۔

بوڑھے نے کہا۔ ''یہاں ریاست کی طرف سے نمائش ہو رہی ہے، آپ وہ دیکھ سکتے ہیں۔ شام کو مہاراجہ کو پولو کھیلتے ہوئے دیکھئے۔ اس کے علاوہ سینما اور تھیٹر ہیں''۔

''تم میرا مطلب بالکل نہیں سمجھے۔ میرا مطلب ہے۔ کوئی ایسی جگہ جہاں آدمی اپنا دل بہلا سکے''۔

بوڑھے نے کہا۔ صاف صاف کہئے۔ کہ آپ کو کوئی خوبصورت لڑکی یا عورت درکار ہے''۔

اس نے خوشی سے اچھل کر کہا۔ ''بالکل بالکل اب تم ہماری بات سمجھ گئے''۔

بوڑھے نے لمبا سا منہ بنا کر کہا۔ ''صاحب۔ ایسی بات کا ذکر پھر نہ کرنا۔ مہاراجہ نے ایسی باتوں

کی سخت بندش کردی ہے۔آپ جن باتوں کے خواب لے رہے ہیں، وہ اب سری نگر میں ناممکن ہیں۔

اس کا چہرہ اتر گیا۔اور وہ چپ چاپ جھیل کے نیلے پانی کی طرف جھانکنے لگا۔

سری نگر میں رومان کو نایاب پا کر وہ مضافات میں گیا۔شالا مار،نشاط باغ سب چھان مارے،مگر اس کے دل کی کلی کسی جگہ نہ کھلی۔یہاں رومان کے تمام لوازمات موجود تھے۔سبزہ، سیب کا درخت، خوبصورت فوارے، روح پرور نسیم،مگر نہ تھی تو صرف ایک خوبصورت کشمیری لڑکی، جس کی عدم موجودگی میں تمام چیزیں پھیکی اور بے لطف نظر آتی تھیں۔جب کبھی وہ کسی خوبصورت لڑکی کو روش پر اکیلا آتا ہوا دیکھتا،اس کی امید بندھ جاتی کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا،مگر جلد ہی اس لڑکی کے پیچھے اس کے رشتہ داروں کا ہجوم آتا ہوا دکھائی دیتا۔اور وہ پھر ناامید ہو جاتا۔

ایک دفعہ اس کے رومان کی کمند تب ٹوٹی جب دو چار گز لب بام رہ گیا تھا۔ایک خوبصورت دوشیزہ ایک فوارے کے قریب پھسل پڑی۔اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر دوڑ کر اسے سہارا دینا چاہا،مگر اس کی بدقسمتی کہ اس کے پہنچنے سے پہلے لڑکی کا بھائی وہاں پہنچ گیا اور وہ بے نیل و مرام واپس آ گیا۔

سری نگر میں دو ہفتے رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا، کہ یہ جگہ رومان سے سراسر خالی ہے۔بہت سے لوگوں سے اس نے سنا کہ رومان نواز طبیعتوں کے لیے پہلگام سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔پہلگام کے متعلق لوگوں نے اسے عجیب غریب حکائتیں سنائیں۔پہلگام میں ہندوستان کی رنگین مزاج عورتیں آتی ہیں، پہلگام میں خوبصورت بیوائیں ہیں، پہلگام میں کئی حسین دوشیزائیں تن تنہا خیمہ زن ہیں، پہلگام میں آزاد خیال بنگالنیں ہیں۔اس قسم کی باتیں سن کر اسے یقین ہو گیا کہ اس نے سری نگر آ کر سخت غلطی کی ہے، اور اسے دراصل پہلگام جانا چاہیے تھا۔دوسرے دن وہ پہلی لاری پر سوار ہو کر پہلگام پہنچا۔یہاں پہنچ کر اس نے ایک خیمہ کرائے پر لیا اور رومان کا انتظار کرنے لگا۔شام کے وقت اس نے کشمیر پر جانے والی سڑک پر عورتوں اور آدمیوں کا جم غفیر دیکھا۔اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ سارا پنجاب پہلگام میں وارد ہوا ہے۔دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ پلوں کے قریب، پہاڑیوں کے دامن میں جہاں تک اس کی نظر کام کرتی تھی، عورتیں ہی عورتیں نظر آتی تھیں۔یہ دیکھ کر اسے ایک گونہ تسلی ہوئی۔اس کا

خیال تھا کہ اتنی عورتوں میں سے رومان کی گنجائش کا نکل آنا ناممکنات میں سے نہیں۔ اس دن جب وہ خیمے میں واپس آیا تو تمام رات ایک نامعلوم خلش سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ دو تین دنوں کے بعد جب وہ پہلگام کی بستی سے بخوبی واقف ہوگیا تو اس نے رومان نواز عورتوں کا کھوج لگانا شروع کیا۔ حسن اتفاق سے اس دن آسمان ابر آلود تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دریا کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر کے بعد اسے دو لڑکیاں پیچھے سے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ انہوں نے نیلے رنگ کی ساڑھیاں پہن رکھی تھیں، سر ننگے تھے، اور بالوں میں بہت سے پھول گوندھے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا۔ ''ضرور یہ بنگالی لڑکیاں ہیں''۔ وہ رک گیا۔ جب لڑکیاں اس کے پاس پہنچ گئیں، تو اس نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں بہت پیاری معلوم ہوئیں وہ ان کے پیچھے ہولیا۔ جب وہ شہر سے تقریباً آدھ میل دور چلا گیا، تو اس نے جرات کر کے ان سے ہم کلام ہونا چاہا۔ وہ دو تین دفعہ کھانسا اس نے بولنے کی کوشش کی مگر باوجود کوشش کے وہ بول نہ سکا۔ چار پانچ منٹ بعد وہ پھر کھانسا اور اس نے ہمت کر کے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں لڑکیوں سے پوچھا۔ ''کیا آپ بنگالنیں ہیں''۔ ایک لڑکی نے کڑک کر کہا۔ ''آپ کا اس بات سے کیا مطلب کہ ہم کون ہیں'' وہ سہم گیا۔ مگر موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اسنے جھوٹ موٹ کہا۔ ''میں بنگالی ہوں۔ اس لیے پوچھا تھا''۔ دوسری لڑکی نے نہایت غصے سے کہا۔ ''آپ بنگالی ہیں تو جہنم میں جایئے، راہ چلتی عورتوں کو چھیڑنے کا آپ کو کوئی حق نہیں''۔ ''میں نے آپ کو چھیڑا تو نہیں بہن''۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''خاموش!'' دونوں لڑکیوں نے چیخ کر کہا۔ ''ورنہ ابھی پولیس کے حوالے کریں گے''۔ اسے ایک ناقابل برداشت خفت کا احساس ہوا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھتا ہوا ان لڑکیوں سے آگے نکل گیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد وہ چہل قدمی کرتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچا۔ جو چیل کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ اس کے عین درمیان ایک خیمہ کھڑا تھا۔ جس کے دروازے پر ایک خوبصورت عورت نیم برہنہ قسم کا لباس پہنے انگڑائی لے رہی تھی۔ ''ہونہ ہو'' اس نے سوچا۔ ''یہ کسی خوبصورت بیوہ کا خیمہ ہے، ورنہ وہ اس توبہ شکن لباس میں کھڑی ہو کر انگڑائی نہ لیتی''۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس خیمہ کے قریب گیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلتی۔ عورت نے گرج کر کہا۔ ''تم کون ہو؟ اور یہاں کس لیے آئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شارع عام نہیں''۔ وہ بوکھلا سا

گیا۔ مگر اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے لکنت آمیز انداز میں کہنے لگا۔ ''کیا بائی سرن کو یہیں سے راستہ جاتا ہے''۔ مجھے معلوم نہیں۔ عورت نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''وہ ہمارا خاکروب آ رہا ہے۔ اس سے پوچھو''۔

مگر خاکروب سے ہم کلام ہوئے بغیر آگے نکل گیا۔

اس اتوار کو اس نے چندن واڑی کہ جو پہلگام سے سات میل دور تھی، جانے کی صلاح ٹھہرائی۔ اس نے کرائے پر ایک گھوڑا لیا، اور علی الصباح چندن واڑی کی طرف روانہ ہوا۔ دو تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے تین چار لڑکیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ آپس میں خوش فعلیاں کر رہی تھیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر اس کا دل مسرت سے ناچنے لگا۔ وہ اپنا گھوڑا ان کے گھوڑوں کے قریب لایا۔ جونہی لڑکیوں نے اسے دیکھا وہ بالکل چپ ہو گئیں۔ رنگ حیا سے ان کے کان تک سرخ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گھوڑوں کی رفتار کو مدھم کر لیا، تاکہ وہ ان سے آگے نکل جائے، مگر اسے یہ ہرگز منظور نہ تھا۔ لڑکیوں نے اپنے گھوڑے کھڑے کر لیے، اس نے بھی اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ لڑکیوں نے اپنے سر نیچے جھکا لیے، وہ دائیں بائیں جھانکنے لگا۔ چند ثانئے نہایت خاموشی سے گذرے۔ اس کے بعد ان تینوں میں سے ایک لڑکی نے جو ذرا شوخ تھی کہا۔ ''اس طرح کب تک یہاں کھڑے رہیں گے، ہم تو آگے جاتے ہیں''۔ یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑی لگائی، باقی دو وہیں کھڑی رہیں۔ نوجوان نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کا فیصلہ کر لیا اور وہ بھی لڑکی کے تعاقب میں ہوا ہو گیا۔ راستہ نہایت تنگ اور پتھریلا تھا، جگہ بہ جگہ موڑ تھے، ایک دو موڑ خیریت سے گزرے، تیسرے موڑ پر نوجوان کے گھوڑے نے جو ٹھوکر کھائی تو سوار سمیت کھڈ میں جا پڑا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ نوجوان کو کچھ پتا نہیں۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو سری نگر کے سول ہسپتال میں پایا۔ اسے تمام جسم پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تقریباً پندرہ دن وہ مرہم پٹی کرواتا رہا جب اس کے زخم کچھ بھرنے لگے تو اس نے واپس آنے کا ارادہ کیا......

گھر پہنچ کر پہلا کام اس نے یہ کیا کہ تمام رومانی افسانوں، ناولوں اور نظموں کو پھاڑ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مصنفوں اور شاعروں کو لاتعداد گالیاں دیں۔ انہیں جھوٹے دروغ

گودھو کا باز اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ مگر ایسا کر کے اس نے صرف اپنی ناتجربہ کاری کا ایک اور ثبوت دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا سادہ لوح تھا، کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ رومان کی تلاش میں اگر شاعروں اور افسانہ نویسوں کے دل زخمی ہوتے ہیں تو عام آدمیوں کے سر پھٹتے ہیں۔

☆☆☆

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر......

کسی شخص کی بدقسمتی کا اندازہ اس کے ہمسایوں کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جس شخص کا کوئی ہمسایہ نہیں، اس کا شمار ہم دنیا کے ان چند ایک خوش قسمت انسانوں میں کر سکتے ہیں، جن میں نظام حیدر آباد، راک فیلر اور ہنری فورڈ شامل ہیں۔ بصورت دیگر اگر کسی شخص کے چار یا پانچ ہمسائے ہیں تو اس شخص کی بدقسمتی کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ کوئی علاج اور ہمیں کچھ تعجب نہ ہوگا اگر وہ شخص شیکسپئر کے مشہور کردار ہیملٹ کی طرح دن رات یہی سوچتا رہتا ہو۔ ''زندگی اچھی یا خودکشی۔ خودکشی اچھی یا زندگی''۔

قیاس اغلب ہے کہ ان اشخاص میں اردو کے جلیل القدر شاعر مرزا غالب بھی شامل تھے، کیونکہ ایک جگہ اپنے ہمسایوں سے تنگ آ کر فرماتے ہیں:۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر کہاں کوئی نہ ہو

ذرا خیال فرمایئے۔ مرزا علی الصباح اٹھتے ہیں۔ اور اپنے ہمسائے سے کہتے ہیں۔ ''سنئے گا۔ مطلع عرض ہے'' اور کوڑ مغز ہمسایہ کہتا ہے۔ ''ہاں مرزا! مطلع کے متعلق آپ کیا کہہ رہے تھے۔ مطلع تو بالکل صاف ہے''۔ یا مرزا فرماتے۔ دیکھئے کل رات کیا اچھا شعر موزوں ہوا۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا ..... غم روزگار ہوتا

اور شعر و شاعری سے بے بہرہ ہمسایہ فرماتا۔ ''ہاں مرزا! روزگار کا بہت برا حال ہے۔ تین دن سے دکان پر ایک گاہک تک نہیں پھٹکا''۔

اب بتایئے مرزا سر پیٹ کر کیوں نہ فرمائیں کہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو'' مگر اس پر بس نہیں۔ مرزا ہمسایوں سے اتنے تنگ ہیں۔ کہ فرماتے ہیں:

بے درد و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

بہت خوب! کیونکہ اگر گھر کے در و دیوار ہوئے، تو ہمسایہ بھی ضرور ہوگا۔اس لیے بے در و دیوار سا گھر بنانے سے ہی اس کم بخت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اب مرزا تو ٹھہرے شاعر، جن کے لیے جیسی بستی ویسا ویرانہ، مگر اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں کہ جن کو ساری عمر بستی میں گزر کرنا ہے، اور جن کے ایک چھوڑ پانچ ہمسائے ہیں۔

آپ ہمارے پہلے ہمسائے سے متعارف ہو جئے۔ یہ صاحب کسی نام نہاد بیمہ کمپنی میں کلرک ہیں، مگر آپ کے اقوال اور افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ کلرکی تو صرف ان کا شغل ہے، ورنہ پیشے کے لحاظ سے وہ طبیب واقع ہوئے ہیں۔آں جناب کی حالت یہ ہے کہ امیر مینائی کی طرح ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' فرق اتنا ہے کہ امیر مینائی تو کسی کو کانٹا چبھنے پر تڑپتے تھے، یہ صاحب بغیر کسی ایسی خلش کے تڑپا کرتے ہیں۔اور وقت بے وقت ہر تندرست اور بیمار شخص کے لیے نسخے تجویز کرتے رہتے ہیں۔مثلاً آپ کو کھانسی ہے، ذرا خیال رکھئے۔کس وجع الصدر نہ ہو جائے۔آج ہی شربت بنفشہ خرید لیجئے، اور کم از کم دو ہفتے پیجئے''......

آپ کی آنکھیں ظاہر کرتی ہیں، کہ آپ کو قبض ہے، علی الصباح ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا کریں۔آپ روز بروز دُبلے ہو رہے ہیں۔کہیں رات کو پسینہ تو نہیں آتا؟''

ان کا مقولہ ہے کہ تندرستی کا انحصار تین باتوں پر ہے:۔

(1) صبح چار بجے اٹھ کر سیر کرنا

(2) سرسوں کے تیل سے مالش کرنا

(3) انگریزی برش کی بجائے مسواک کرنا۔

سیر کے متعلق ان کا اعتقاد ہے کہ یہ کم از کم دس امراض کا واحد علاج ہے۔چنانچہ آپ نے ایک چارٹ (نقشہ) تیار کیا ہے جس کی ایک کاپی اپنے ہر ایک ہمسائے کو مفت مہیا کرتے ہیں۔ اس چارٹ میں لکھتے ہیں:۔

بدہضمی کی دوا.........لارنس باغ کے پانچ چکر

سر درد کی دوا.........لارنس باغ کے چار چکر

پیٹ درد کی دوا.........لارنس باغ کے دو چکر

آپ سیر کے اتنے شوقین ہیں کہ ان کا یہ شوق مرض کی انتہا تک جا پہنچا ہے۔ سردی ہو یا برسات، آندھی ہو یا طوفان، جون ہو یا دسمبر، یہ سیر کرنے ضرور جائیں گے اور کم از کم دو تین ہمسایوں کو اپنے ساتھ لے جانے پر مصر ہوں گے اور پھر جو شخص کسی بے وقوفی کے لمحے میں ان کا شریک حال ہو جائے تو اس کا ڈاکٹر یا خدا ہی حافظ ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک سیر اور سفر میں بہت کم فرق ہے۔ دس میل کی روزانہ مسافت کو یہ حضرت سیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب لارنس باغ جو آپ کے گھر سے چار میل پر ہے، پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بس اب دو میل اور اور پھر فضا کچھ ٹھیک ہو جائے گی اور ہماری سیر و تفریح شروع ہو گی۔ ایک دو دفعہ مجھے بھی سیر پر گھسیٹ کر لے گئے۔ واپسی پر میرا یہ حال تھا کہ قدم ڈگمگا رہے تھے، سانس پھولا ہوا تھا اور جسم پسینہ میں تر بتر۔

سرسوں کے تیل کی مالش ان کا دوسرا مجرب نسخہ ہے اور جو شخص اس تیل کی مالش نہیں کرتا وہ ان کے نزدیک گردن زدنی اور کشتنی ہے۔ یہی بات مسواک کے متعلق ہے، جو شخص انگریزی برش استعمال کرتا ہے وہ اپنے دانتوں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

الغرض ہمارے یہ ہمسائے جو ہر درد کا درماں جانتے ہیں اور بلا فیس بتاتے ہیں، خود بلائے بے درماں ہیں۔ جن سے سوائے نقل مکان اور موت کے رہائی حاصل کرنا اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا کہ قفس یا جیل خانے سے بچ کر نکلنا......

ہمارے دوسرے ہمسائے شکل اور لباس کے اعتبار سے انسان ہیں لیکن اگر ان کو انسان نما ریڈیو کہا جائے تو زیادہ موزوں ہو گا۔ کیونکہ ریڈیو کی طرح یہ بزرگ صبح 8 بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک کچھ نہ کچھ فرماتے رہتے ہیں۔ سیاست، فلمیں، مسلم لیگ، کانگرس، ہوائی حملے، بھونچال، قحط، بھوک، بیکاری، مردم شماری ان کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ سیاست میں اکثر یہ ہندوستانی اور انگریزی سیاستدانوں کی غلطیوں اور گناہوں کی فہرست تیار کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ ''وائسرائے کی غلطی ہے۔ اور سچ پوچھو تو یہ کانگرس کی بھی غلطی ہے۔ اور مسلم لیگ کی بھی۔ قصور مسٹر جناح کا ہے۔ مگر مہاتما گاندھی کو بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ سب کی غلطی ہے۔ آپ دیکھیں نہ یہ غلطی نہیں تو اور کیا ہے، نہیں مگر یہ غلطی نہیں، اس کو غلطی کہنا ہی غلطی

ہے۔ یہ جرم ہے''۔

سیاست کے بعد ان کی دوسری دلچسپی کی چیز فلم ہے۔ فلموں کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ ''فلاں ایکٹر فلاں کمپنی کو چھوڑ کر فلاں کمپنی میں شامل ہو گیا ہے۔ اب اس ایکٹر کا کیا بنے گا! اب اس کمپنی کا کیا بنے گا! فلاں ایکٹرس فلاں ایکٹر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ خدا جانے کہاں بھاگ گئے ہیں! آپ اس ایکٹر کو جانتے ہیں۔ کیوں نہیں جانتے؟ آپ کا اس فلم کے متعلق کیا خیال ہے؟ آپ نے یہ فلم کیوں نہیں دیکھی؟ آپ ہر ایک فلم کیوں نہیں دیکھتے؟''......

ہمارے تیسرے کرم فرما کسی سکول میں مدرس ہیں۔ آپ کا تکیہ کلام ہے۔ ''میں پوچھتا ہوں، آپ کے پاس یہ چیز ہے؟'' چنانچہ آپ بجائے بازار، ڈاک خانہ یا ہسپتال جانے کے وقتاً فوقتاً ہمارے پاس تشریف لے آتے ہیں، اور میں کہتا ہوں آپ کے پاس ایک گولی کونین کی ہے، ایک آنے کی ٹکٹ ہے؟ پرسوں کا اخبار ہے؟ پچھلے سال کا کیلنڈر ہے، اس سال کی جنتری ہے؟ پریم چند کی کہانوں کا مجموعہ ہے؟ اقبال کے اشعار کا انتخاب ہے؟ وغیرہ وغیرہ سوالوں سے ہمارا ناک میں دم کیا کرتے ہیں۔ ایک دن نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگے۔ ''آپ کے پاس ادب لطیف کا سالنامہ ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کیوں'' اس کی کیا ضرورت پیش آئی'' کہنے لگے۔ ''یونہی، کچھ نہیں۔ اس میں سے ہارلکس کا اشتہار پڑھنا تھا''۔

☆☆☆

ہمارے چوتھے ہمسائے ان اشخاص میں سے ہیں، جن کو لیڈر کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ان کو ہر وقت قوم کو غم کھائے جاتا ہے اور اس غم میں وہ اس طرح روتے ہیں۔ گویا اس شاعر کے مصرع کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ جس نے کہا تھا۔ ''ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں''۔

وہ جس وقت ہمارے پاس آتے ہیں، قوم کی لاش پر آنسو بہانے آتے ہیں، اس قوم کا اب کچھ نہیں بن سکتا۔ ہندوستانی دنیا میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ چینی ہندوستانیوں سے بھی پست حالت میں ہیں، مگر ست الوجودی میں ہم چینیوں سے بھی پست تر ہیں۔ انگریزی مزدور کی روزانہ آمدنی تین روپے ہے، امریکن مزدور کی ساڑھے چار روپے، آسٹریلین کی پانچ روپے اور ہندوستانی مزدور کی آمدنی صرف چھ پیسے یومیہ ہے''۔ یا اس طرح اس سال ہندوستان میں دو لاکھ کی کھانڈ باہر سے آئی، 3 لاکھ کے سگریٹ آئے، دس لاکھ کے کھلونے آئے، افسوس

اس ملک کا کیا بنے گا''۔ ہر وقت مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ میں چرخہ کب خریدوں گا اور سوت کب کاتنا شروع کروں گا''۔ سودیشی تحریک کے یہ دلدادہ ہیں مگر گھڑی سوئٹزرلینڈ کی اور سگریٹ انگلینڈ کا خریدتے ہیں۔ لکھنے کا قلم امریکہ کا، تیل اور کریم فرانس کے اور کھانڈ جاوا کی استعمال کرتے ہیں۔

☆☆☆

اس کے علاوہ ہمارے ایک اور ہمسائے ہیں کہ جو سوشلسٹ واقع ہوئے ہیں۔ آپ ہر وقت مہیب اور خطرناک الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مثلاً زلزلہ آئے گا، ایک زبردست طوفان اٹھے گا، بجلیاں کڑکیں گی۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی۔ آپ کو ناز ہے کہ آپ نے سوشلزم کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے آج تک صرف لینن کی سوانح عمری پڑھی ہے۔ وہ سوانح عمری جس کا روسی زبان سے فرانسیسی، فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اپنی ہر تقریر کا آغاز ''ماسکو'' سے کرتے ہیں۔

''ماسکو میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ ماسکو میں اگر کوئی یہ بات کرے تو اسے فوراً گولی کا نشانہ بنا دیا جائے، ماسکو میں اگر کوئی شخص بازار میں کیلے کا چھلکا پھینک دے، تو اسے دو سال قید بامشقت کی سزا ہو جائے''۔ آپ ہر وقت دنیا کے نظام کو بدلنے کی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ ہر وقت ملک کی خاطر سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہیں، جرات کا یہ حال ہے کہ جس دن شہر میں گرفتاریاں یا خانہ تلاشیاں ہو جائیں، آپ خوفزدہ کبوتر کی طرح سہمے سہمے پھرتے ہیں، رک رک کر بات کرتے ہیں۔ اور اپنے پرانے اخبارات کو پلندہ جو کہ آپ کا واحد اثاثہ البیت ہے، میرے گھر پھینک جاتے ہیں کہ مبادا ان اخبارات میں سے کوئی خلاف قانون چیز برآمد نہ ہو جائے۔ لمبا ترچھا قد ہے اور منہ پر ہر وقت کسی نامعلوم خطرے کے زیر اثر ہوائیاں اڑتی رہتی ہیں چہرے پر فاقہ مستی اسی طرح لکھی ہوئی ہے کہ پہلی ملاقات میں سب سے پہلے یہی چیز نظر آتی ہے۔ اکثر جوش ملیح آبادی کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسلی دیا کرتے ہیں اور اگرچہ آپ میں شباب کے آثار تک غائب ہیں اور آپ تغیر کے معنی سے قطعاً ناواقف ہیں لیکن ہر صبح نہایت جوش سے اپنی بھاری آواز میں گایا کرتے ہیں۔

کام ہے میرا تغیر۔ نام ہے میرا شباب

آپ کا نیک ارادہ دنیا بھر کے خاکروبوں کو منظم کرنا ہے۔ اس کے بعد ''دھوبیوں کی انجمن''، ''نائیوں کی انجمن''، ''بیکاروں کی انجمن''، ''بہشتیوں کی انجمن''، ''ہرکاروں کی انجمن'' ''شامت کے ماروں کی انجمن'' وغیرہ قائم کریں گے۔ آپ کا خیال ہے کہ آپ غلطی سے ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں جہاں آپ کی لیاقت کی بہت کم قدر کی گئی ہے۔ اس لیے بار بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ اگر میں ماسکو میں پیدا ہوتا تو......''۔

☆☆☆

سنانے کا مرض

سنانے کا مرض!.......... عنوان سے گھبرایئے نہیں اور نہ ہی یہ سمجھئے کہ یہ کوئی فرضی یا خیالی مرض ہے۔ باور کیجئے کہ بیسویں صدی میں جن نئے امرض سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک ''سنانے کا مرض'' ہے۔ یہ مرض اس شدت اور سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے کہ اس کو مرض کی بجائے وبا کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کی علامات خفقان اور ہذیان سے ملتی جلتی ہیں۔ مگر اس کی دو اپنی علامات ہیں جو کسی اور مرض میں نہیں پائی جاتیں۔

(1) اس مرض میں صرف ادیب، افسانہ نویس اور شاعر مبتلا ہوتے ہیں۔

(2) مرض کی تکلیف مریض کے خویش واقارب کی بجائے دوستوں کو اٹھانی پڑتی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس مرض کی تشریح کی گئی ہے۔

آج کل جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تقریباً ہر شخص جس نے کہ دیوان غالب کا سرورق پڑھا ہے، کم وبیش شاعر ہے، اور اگر وہ یہ جانتا ہے کہ وصال اور جمال، اختیار اور انتظام ہم قافیہ ہیں، تو وہ نہ صرف شاعر ہی ہے بلکہ نا خدائے سخن اور ملک الشعراء بھی۔ جس وقت کوئی شخص ملک الشعرا کے درجے تک پہنچ جاتا ہے تو اسے فوراً سنانے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ آپ نہیں سمجھے؟ تھوڑی سی تشریح اور کیے دیتا ہوں، آپ کو یاد ہو گا کہ بسا اوقات، جب کہ آپ کچھ سوچتے، کچھ اونگھتے سڑک پر جا رہے ہیں۔ آپ کا کوئی ''شاعر'' دوست پیچھے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آپ کو اس طرح آ دبوچتا ہے، گویا کہ وہ سیر کے لیے نہیں بلکہ شکار کرنے نکلا تھا۔ خیر و عافیت، موسم اور جنگ کے متعلق بات چیت کرنے کے بعد ایک عجیب مسکراہٹ کے ساتھ وہ اچکن کی جیب سے

ایک میلا کچیلا کاغذ جس پر چند سطریں پنسل سے لکھی ہوئیں ہوتی ہیں، متعدد کاٹی ہوئی اور کچھ مٹائی ہوئی بھی۔ نکالتا ہے اور پیشتر اس کے کہ آپ بھاگ سکیں، یا پکار سکیں 'مدد! مدد!!' وہ اپنے ''تازہ افکار'' پڑھ کر سنانا شروع کر دیتا ہے۔

''سنئے صاحب! مطلع عرض کیا ہے۔ ہاں جناب! مطلع عرض کیا ہے، پھر عرض کیا ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ شعر پڑھتا ہے، مسکراتا ہے، اور آپ کی طرف ملتجی نظروں سے تاکتا ہے جو کہہ رہی ہے۔ ''پہلے شعر پر آپ چپ رہے۔ دوسرے پر بھی چپ رہے۔ اب تیسرا پڑھ رہا ہوں۔ اب تو داد دیجئے''۔ جوں جوں شعر پڑھتا جاتا ہے۔ آواز میں جوش اور بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب مقطع پر پہنچتا ہے۔ تو اس زور سے آواز نکالتا ہے کہ سڑک چلنے والے چھوٹے بچے سہم کر اپنی ماؤں سے چمٹ جاتے ہیں۔ اگر وہ پرانی طرز کی غزلیں لکھتا ہے تو عموماً آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن اشعار کو وہ اپنی ملکیت سمجھ رہا ہے، وہ آپ نے مدت ہوئی دیوان فانی یا دیوان حسرت میں پڑھے تھے۔ اگر وہ ترقی پسند شاعر ہے تو آپ کو جلد پتا چل جاتا ہے کہ وہ نثر کو نظم اور نظم کو نثر سمجھنے کا عادی ہے۔ بدقسمتی سے میری ایک ترقی پسند شاعر سے جان پہچان ہے۔ آپ کچھ اس قسم کی نظم لکھتے ہیں:۔

کاش اک کشتی میں ہم تم بیٹھ کر
بھاگ جائیں دور۔ اس دنیا سے دور
پیشتر اس کے کہ تیرا بوڑھا باپ
ہاتھ میں لمبا سا ایک پستول لے
مار کر گولی کرے مجھ کو ہلاک
اور غش کھا کر گرے تو خاک پر
یا گریباں کر کے اپنا چاک چاک
جانب جنگل میں بھاگوں اس طرح
جس طرح لیلیٰ کے پیچھے بھاگتا
جا رہا مجنوں کسی ہو دشت میں

اگرچہ انہیں معلوم ہے کہ میں اس قسم کی ''جدید شاعری'' کو سخت ناپسند کرتا ہوں، کیونکہ

مجھے اس روش کے شاعر کے دماغی نوازن کے متعلق ہمیشہ شبہ رہتا ہے اور ساتھ ہی، ایسی نظم سنتے وقت ہنسی کو ضبط کرنا نہایت گراں معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ جہاں بھی مجھے دیکھ پاتے ہیں۔ فوراً ''ایک چھوٹی سی نظم سنتے جایئے'' کہہ کر مجھ پر اشعار کی بمباری شروع کر دیتے ہیں۔ اور سلسلہ کلام اس فقرہ پر ختم کرتے ہیں، یہ ہے ترقی جو اردو شاعری نے غالب اور اقبال کے بعد کی۔

ایک دفعہ آپ نے اصرار کے ساتھ مجھے اپنی ایک نظم جس کا عنوان ''جدت'' تھا، بازار میں ایک دکان سے سودا خریدتے ہوئے سنائی۔ وہ نظم آزاد بحر میں تھی اور اس میں جدت یہ تھی کہ ہر ایک مصرع میں ایک آدھ لفظ پہلے مصرع سے کم ہوتا جاتا تھا، حتیٰ کہ مقطع پر پہنچتے پہنچتے صرف ایک لفظ رہ جاتا۔ کچھ اس طرح کے ''شعر'' تھے۔

آسماں میں چمک رہا۔ چاند ہے۔
آسماں میں چاند دیکھ
چاند دیکھ عید کا
عید کا

ہے
چاند یہ
دیکھ!
دیکھ!!
دیکھ
بھی!!!

نظم سنانے کے بعد کہنے لگے۔ ''کیوں، کیا خیال ہی آپ کا؟''۔

جھومتے ہوئے میں نے کہا۔ ''واللہ، غضب ہی تو کر دیا آپ نے ...... کاش آج حضرت غالب زندہ ہوتے تو آپ کے غیر فانی اشعار کی داد دیتے۔ بس پھڑک گیا میں تو''۔

آپ نے نہایت والہانہ انداز میں فرمایا۔

''ہاں! غالب اور حالی والی لکھتے تھے، لیکن وہ اب پرانے ہو چکے ہیں، وہ کیا جانیں۔ جدید شاعری کیا ہوتی ہے''۔

ان کے علاوہ ہمارے ایک اور شاعر مزاج دوست بھی ہیں جن کو یہ مرض بری طرح لاحق ہے۔ یہ نظم لکھنے کے بعد ہمیشہ کس مجمع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب تک کم از کم دو درجن احباب کو وہ نظم نہ سنالیں، انہیں دلی تسکین نہیں ہوتی۔ ایک دن گھر میں کوئی بیمار تھا، میں نہایت تیزی سے سائیکل پر ڈاکٹر کے ہاں جا رہا تھا، آپ سڑک کے کنارے کھڑے تھے، جونہی مجھے آتے دیکھا، لپک کر سائیکل پکڑ لیا، میں نے لاکھ معذرت چاہی، مگر آں حضرت نے تب تک آگے نہ بڑھنے دیا، جب تک مطلع سے مقطع تک ایک ایک شعر دوبارہ سہ بارہ پڑھ کر نہ سنا لیا۔ آپ اشتراکی شاعر ہیں۔ یعنی آپ کی ہر نظم شعلہ، بگولہ، شرارہ یا چنگاری ہوتی ہے۔ عموماً موضوع زلزلہ یا طوفان، مزدور یا خون ہوتا ہے۔ آپ اپنی ہر ایک نظم گا کر سناتے ہیں اور سناتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ سڑک پر جا رہے ہیں یا باغ میں ٹہل رہے ہیں۔

☆☆☆

شاعروں سے دوسرے درجے پر اس قسم کے مریض آپ کو افسانہ نویسوں میں ملیں گے۔ اب کچھ دنوں سے تقریباً ہر خواندہ شخص افسانہ نویس ہے اور جب سے آنجہانی منشی پریم چند کی وفات ہوئی ہے، تقریباً ہر شخص ان کا جانشین بھی۔ ہر ایک شخص اس معذرت کے ساتھ افسانے لکھ رہا ہے کہ جو مبارک کام منشی پریم چند نے شروع کیا تھا، اس کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ آپ کے متعدد دوست اب دن رات افسانے لکھ رہے ہیں اور جب اپ کی ان سے سر راہے ملاقات ہوتی ہے تو پہلی خوش خبری جو آپ کے گوش گزار کی جاتی ہے، وہ یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک ''نئی چیز'' لکھی ہے جو آپ کو سنانا چاہتے ہیں۔ کسی زمانے میں ''چیز'' کی اصطلاح گانے والے لوگ ہی استعمال کرتے تھے۔ مگر اب اس چیز کو لکھنے والوں نے اپنا لیا ہے۔ عموماً یہ ''چیز'' تھامس ہارڈی، سٹیونسن، یا ایچ۔ جی ویلز کے کسی انگریزی افسانے کا ترجمہ ہوتی ہے اور بہت دفعہ جناب افسانہ نویس صرف انگریزی کی بجائے ہندوستانی نام استعمال کر کے اردو افسانہ نویسی کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست جو کہ اب ایک کامیاب افسانہ نویس ہیں، یعنی وہ اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کر چکے ہیں اور ریڈیو پر دو بار کہانی پڑھ آئے ہیں، ایک دن مجھے اپنی ایک تازہ چیز سنا رہے تھے۔ اتفاق سے اس سے ایک دن پہلے میں آرنلڈ بینٹ کا یہی افسانہ انگریزی میں پڑھ چکا تھا۔ اب جو سنتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ ''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے''۔

افسانہ سنانے کے بعد آپ کہنے لگے۔ کیسا ہے؟ میں نے دبی زبان سے کہا۔ ''اچھا ہے، بہت اچھا ترجمہ کیا ہے''۔ ترجمہ کے نام پر آپ جھلا اٹھنے۔ کہنے لگے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یقین نہ ہوتو آرنلڈ بینٹ کے افسانوں کا مجموعہ ثبوت میں حاضر کر سکتا ہوں''۔ اس پر آپ کچھ جھینپے اور فرمانے لگے'' ممکن ہے آرنلڈ بینٹ نے بھی اس قسم کا کوئی افسانہ لکھا ہو''۔ اس طرح ایک اور دوست ہیں، جنہوں نے مجھے اپنے پانچ افسانے سنائے اور پھر درخواست کی کہ میں ان افسانوں کے مجموعے کا نام تجویز کر دوں۔ میں نے کہا ''پانچ ڈاکے'' بہت اچھا نام ہے۔ وہ ذرا حیران سے ہوئے۔ مگر میں نے نام ٹھیک تجویز کیا تھا، کیونکہ پانچوں کے پانچوں افسانے کسی نہ کسی انگریزی یا اردو افسانہ نویس سے چرائے ہوئے تھے۔

ایک اور صاحب! ایک دن مجھے افسانہ سناتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ افسانہ انہوں نے پریم چند کے رنگ میں لکھا ہے۔ افسانہ سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ''رنگ'' کا مطلب یہ حضرت سو فیصدی نقل لیتے ہیں کیونکہ افسانہ میں کرداروں تک کے نام وہی تھے، جو پریم چند کے افسانے میں تھے۔ میرے ایک دور کے رشتے دار کو بھی سنانے کا مرض لاحق ہے۔ آپ کو یہ وہم ہے کہ آپ اردو افسانہ نویسی میں ایک نئے دور کے بانی ہیں۔ آپ افسانہ سنانے سے پہلے اس کے متعلق ایک لمبی چوڑی تمہید سناتے ہیں۔ ایک افسانے کے بارے میں فرمانے لگے کہ اس افسانے کو لکھنے کا خیال انہیں رات کے دو بجے آیا۔ چنانچہ اسی وقت کوٹھے سے اتر کر نیچے بیٹھک میں آئے، لیمپ روشن کیا اور افسانہ لکھنا شروع کیا۔ اتنے میں ایک دو پہرے داروں نے ''چور چور'' کا شور بپا کر دیا۔ آپ اٹھے اور ان کو زبردست ڈانٹ بتائی۔ اس تمہید کے بعد انہوں نے اپنا افسانہ سنایا جو کہ پروفیسر احمد علی کی کتاب ''شعلے'' میں سے حرف بحرف نقل کیا گیا تھا۔ یہی حضرت کبھی کبھی انسانوں کی بجائے جانوروں کے متعلق افسانے لکھتے ہیں، اور دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اردو ادب میں آپ کو ایسے افسانے بہت کم ملیں گے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے اور شاید اسی لیے اردو ادب زندہ ہے۔ اپ نے ایک افسانے کا ہیرو بھیڑیا بتایا ہے، اور ہیروئین لومڑی۔ ان دونوں میں جو راز و نیاز ہوتے ہیں، ان کو آپ نے بہت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے بھیڑیا فطرتاً سفاک ہوتا ہے اور لومڑی فطرتاً مکار، مگر محبت کے پاکیزہ رشتے میں آ کر بھیڑیا اپنی ریاکاری کو بھول جاتا ہے اور لومڑی اپنی مکاری کو فراموش

کر دیتی ہے اس قسم کے آپ نے متعدد افسانے لکھے ہیں اور ہر ایک میں کسی جنگلی جانور کے کارنامے بیان کیے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ اب افسانہ نویسوں کو جنگل کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جانوروں کی نفسیاتی الجھنیں افسانے کے لیے نہایت دلچسپ مواد پیش کرتی ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنا افسانہ ''چیتے کی کشمکش'' مجھے پڑھ کر سنایا۔ وہ افسانہ بقول ان کے آپ نے چیتے کے دماغ میں گھس کر لکھا تھا۔ میں نے از راہ ہمدردی کہا۔ ''آپ جانوروں کو خوب سمجھتے ہیں، اگر افسانہ نویسی چھوڑ کر سرکس کی نوکری کر لیں تو اردو ادب اور آپ کے لیے نہایت مفید ثابت ہو اس کے بعد وہ مجھے کبھی افسانہ سنانے نہیں آئے''۔

الغرض ان مریضوں کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ مرض لا علاج ہے اور آپ کے بہت سے دوست اس کا شکار ہیں۔ اگر انہیں یہی مرض لاحق نہ ہوتا۔ تو شاید وہ ملک یا قوم یا آپ کی کچھ خدمت کر سکتے۔ مگر اب صرف شاعر یا افسانہ نویس بن کر رہ گئے ہیں۔

☆☆☆

اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے

یہ مضمون صرف عام پڑھے لکھے آدمیوں کی راہنمائی کے لیے لکھا گیا ہے۔
اس سے مجھے کسی شخص کی دل آزاری یا دل شکنی مطلوب نہیں

تمہید:۔

گذشتہ چند سالوں میں اردو افسانہ نویسی نے قابل رشک ترقی کی ہے۔ کسی زمانے میں اردو ادب پر شعرا کا تسلط تھا۔ آجکل شعرا کی جگہ افسانہ نویسوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہمیں مرحوم علامہ اقبال کا نعم البدل نہیں مل سکا، مرحوم منشی پریم چند کے ایک سے زیادہ جانشین پیدا ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض نے اپنی جاں نشینی کا اخبارات اور رسائل میں اعلان بھی کر دیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب منشی پریم چند کی جانشینی کے اس لیے حقدار ہیں کہ وہ دیہات کے متعلق افسانے لکھتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ درست ہے کہ وہ اپنے کسی افسانے میں دیہات کی فضا کا صحیح نقشہ پیش نہیں کر سکے مگر ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہر افسانے میں ہل، بیل اور اپلے کے الفاظ آپ کو ضرور ملیں گے، جن سے آپ کی معلومات میں قابل قدر اضافہ ہو

گا۔اسی طرح ایک اور حضرت منشی پریم چند کے اس لیے جانشین ثابت ہوئے ہیں، کہ انہوں نے اپنے ہر ایک افسانے میں ساس اور بہو کی لڑائی کو زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے، غرضیکہ ہر ایک افسانہ نویس کسی نہ کسی وجہ سے اگر پریم چند کا جانشین نہیں، تو ثانی ضرور ہے۔ یہ امر جہاں اردو ادب کے لیے خوشی کا موجب ہے، وہاں عام پڑھے لکھے آدمی کے لیے پریشانی کا باعث بھی ہے۔ کیونکہ آجکل افسانے اس تعداد میں اور اس کثرت سے لکھے جارہے ہیں کہ اگر انہیں ایک قطار میں کھڑا کیا جائے، تو شاید ان کا سلسلہ لاہور سے لے کر حیدرآباد دکن تک پھیلتا ہوا نظر آئے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے ان کے چند نمونے پیش کیے جائیں۔

(1) ترقی پسند افسانے

سب سے پہلے ترقی پسند افسانے ہیں۔ یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی وہ قسم ہے جس میں ایک مزدور پر حد سے زیادہ ظلم ڈھایا جاتا ہے اور آخر میں اسے مار کر پڑھنے والے کے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا کی جاتی ہے۔ عموماً یہ مزدور تار کے کھمبوں یا پہاڑوں کی چوٹیوں سے گر کر مرتے ہیں۔ کئی دفعہ سڑک پر پتھر کوٹتے، ان کو دمہ یا تپ دق کا شدت سے دورہ پڑتا ہے اور ان کی تھوک میں لال رنگ کی ایک گہری لکیر دیکھی جاتی ہے۔ بعض دفعہ ان کو اس قدر بید یا چابک لگائے جاتے ہیں کہ وہ کھڑے کھڑے مرجاتے ہیں۔ یہ ترقی پسند افسانہ نویسی کی سب سے پہلی منزل ہے یا یوں سمجھئے کہ اس قسم کے افسانے صرف پچیس فی صدی ترقی پسند ہیں۔

اس سے زیادہ ترقی پسند افسانے وہ ہیں جن میں مزدور پر ظلم اور مزدور کی عورت سے عشق کیا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں عموماً سرمایہ دار سڑک کوٹنے والی، کارخانوں میں کام کرنے والی، اور مزدور عورتوں کو پھسلانے کی کوشش کرتا ہے اور عموماً ان کو روپے یا رشوت کا لالچ دے کر ان کی عصمت پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ پچاس فیصدی ترقی پسند افسانے ہیں۔

اس کے بعد وہ افسانے ہیں جن میں مزدور سرمایہ دار کی بیوی سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ ضرور ایسے بوڑھے سرمایہ دار کے گھر ملازم ہوتا ہے جس نے بڑھاپے میں دوسری یا تیسری شادی کرنے کی غلطی کی ہے۔ چند دن کے راز و نیاز کے بعد یہ ضرور اپنی مالک کی بیوی کو ساتھ

لے کر رفو چکر ہو جاتا ہے یا موقع پا کر بوڑھے سرمایہ دار کو زہر وغیرہ کھلا کر اپنا راستہ صاف کرتا ہے۔سو فیصدی ترقی پسند افسانے وہ ہیں جس میں بھائی بہن سے یا بیٹا ماں سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ بھائی اور بہن نہایت تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔انہوں نے ڈاکٹر فرائیڈ کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا ہے اور ان کی نظر میں بہن،،بہن نہیں بلکہ ایک عورت ہوتی ہے۔ان افسانوں کو لکھنے والے عموماً وہ نوجوان یا رنڈوے مصنف ہوتے ہیں جن کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہوسکی یا جن کی ماں اور بہن اس قدر خوبصورت ہیں کہ وہ گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی غیر مرد ان کے ساتھ محبت کر سکے۔ وہ ایسے افسانے لکھتے وقت بھول جاتے ہیں کہ یہ ہندوستان ہے جہاں آئندہ دو ہزار سال تک سوائے اپنی بیوی کے کسی اور عورت سے عشق نہیں کیا جا سکتا۔ سو فیصدی ترقی پسند افسانوں میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جن میں مصنف اپنے ذاتی تجربات کسی اور شخص کی زبان سے بیان کرتا ہے۔اس میں عموماً مصنف کے طوائفوں کے پاس جانے یا بھکارنوں کو بہکانے کے واقعات نہایت صاف گوئی سے لکھے جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو اتنا بتانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا کہ آج کل مصنف کن جنسی امراض میں مبتلا ہے۔

(2) جذباتی افسانے

ترقی پسند افسانوں کے بعد جذباتی افسانے آتے ہیں۔ جذباتی افسانوں میں جذبات اور احسابات کی شدت کو نمایاں طور پر بیان کیا جاتا ہے۔مختلف جذبوں کے زیر اثر افسانے کے کردار عجیب وغریب حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔مثلاً ایک افسانے میں سریش کو جب پتا چلتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے نرملا سے شادی نہیں کر سکتا تو وہ نرملا کو اس طرح مخاطب کرتا ہے۔''نرملا۔تم آج سے میری بہن ہو''۔تمہاری بہن؟'' نرملا نے گھبرا کر کہا۔''ہاں ہاں میری بہن'' سریش نے بہن کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''میں سچ کہہ رہا ہوں۔تم آج سے میری بہن ہو۔کاش کہ تم عمر میں مجھ سے پانچ دس سال بڑی ہوتیں اور میں تمہیں ''ماں'' کہہ سکتا''۔اسی طرح ایک افسانے میں دو بھائی ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے ہیں۔مگر جب چھوٹے بھائی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا بھائی ان دونوں کی مشترکہ محبوبہ سے شادی کرنے کو تلا ہوا ہے تو مندر میں دیوی یا دیوتا کے سامنے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ میں دے کر

خود سادھو بن کر زندگی گزارنے کا حلف اٹھاتا ہے۔ جذباتی افسانوں میں قہقہے، آنسو، سسکیاں، قسمیں، ہچکولے، کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ عموماً انجام خودکشی ہوتا ہے، اور محبت کے دیوتا کے سامنے عجیب وغریب قربانیاں دی جاتی ہیں۔

(3) دیہاتی افسانے

جذباتی افسانوں کے بعد ایک آدھ نمونہ دیہاتی افسانوں کا بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ افسانے اپنے دلکش ماحول اور طرز تحریر کی سادگی کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں۔ ان میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی ایسی بات تحریر نہ کی جائے جو غیر فطری یا غیر دیہاتی ہو۔ چنانچہ تشبیہیں، استعارے، محاورے سب دیہاتی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ احساسات تک دیہاتی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ''بیگماں کا قد کماد کے پودے کے طرح لمبا اور اس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ تھے، اس کی آنکھیں جگنو کی طرح چمکتی تھیں، اور اس کی باتیں شکر سے زیادہ میٹھی تھیں، وہ جب اپلے بناتی، تو اس کے گوبر سے لت پت ہاتھ اس طرح معلوم ہوتے جیسے کسی دلہن نے دل کھول کر مہندی لگائی ہے۔ اس وقت شیرو اس کو دیکھ کر اس طرح بیتاب ہو جاتا جس طرح گائے کو ملنے کے لیے بچھڑا۔ وہ اپنا ہل کندھوں سے اتار کر پھینک دیتا اور بیگماں کی طرف اس طرح دیکھتا گویا وہ بیگماں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں پکڑ لے اور اسے اس زور سے بھینچے کہ اس کا چہرہ انار کے پھول کی طرح سرخ ہو جائے''۔

(4) نفسیاتی افسانے

جذباتی اور دیہاتی افسانوں کے بعد ہم نفسیاتی افسانوں کو لیتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہیرو یا ہیروئن کی دماغی کشمکش کو صفحہ قرطاس پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکثر یہ دکھایا جاتا ہے کہ جس وقت انسان سوچنے لگتا ہے تو اس کے خیالات کا سلسلہ ایک ٹیڑھی لکیر کی مانند ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک ہی سیکنڈ میں معشوق، ڈاک خانے سے ہوائی جہاز کا تصور کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک نفسیاتی افسانے کا ہیرو جس کو اس کی محبوب نے کاٹھ کا الو کہا ہے، سڑک پر جا رہا ہے، اس کے محسوسات یا احساسات کو اس طرح بیان کیا جائے گا۔

''اس نے سوچا کہ آیا وہ سچ مچ کاٹھ کا الو ہے۔ وہ بہت دیر سوچتا رہا حتیٰ کہ اسے اپنے کاٹھ

کے الو ہونے کا کچھ کچھ یقین ہونے لگا۔الو،اس نے دل میں کہا۔الو کوئی خاص برا پرندہ نہیں۔خدا جانے اس کو لوگوں نے مفت میں کیوں بدنام کر رکھا ہے۔الو ایک زاہد کی طرح الگ تھلگ زندگی بسر کرتا ہے۔زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر مسجد...... ہاں آج صبح اس نے مسجد کے پاس ایک خوبصورت لڑکی دیکھی تھی......شراب پینے دے مسجد میں...... اسے شراب چھوڑے کتنی مدت ہوگئی تھی......غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی...... پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں......کتنا خوبصورت شعر ہے''۔

اسی طرح ان افسانوں کی ایک قسم وہ ہے جس میں تجربہ نفس کیا جاتا ہے۔مثلاً ''حمید حیران تھا کہ اسے اپنی بیوی سے نفرت کیوں ہے۔حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی رضیہ کوئی بدصورت بھی نہیں۔پھر کیا وجہ تھی کہ اس کی نزدیک آنے پر اس کی روح لرزنے لگتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑ کر اپنے ہمسائے کے گھر پناہ گزیں ہو''۔اس طرح لکھنے کے بعد ہمیں اشاروں اشاروں میں بتایا جاتا ہے کہ دراصل بات یہ تھی، کہ جب حمید اور رضیہ بچپن میں ایک دوسرے سے کھیلا کرتے تھے،تو رضیہ حمید کی بری طرح پیٹا کرتی تھی اور جب حمید دو برس کا خوبصورت بچہ تھا تو ہمسائے کی عورتیں اسے نہایت پیار سے گود میں لیا کرتی تھیں۔ان بچپن کے واقعات نے حمید کے دل و دماغ پر ایسا گہرا تاثر چھوڑا کہ بڑا ہو کر اسے ہمسائے کی عورتیں خوبصورت اور اپنی بیوی بدصورت نظر آنے لگی۔

تیسری اور آخری قسم نفسیاتی افسانوں کی وہ ہے جس میں خیالات کا لامتناہی سلسلہ بیان کیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ افسانے میں کہانی کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔مثلاً کہانی کا ہیرو بازار میں سے گزر رہا ہے۔ایک دکان پر وہ ایک خوبصورت لڑکی کو رومال خریدتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس رنگ کا لڑکی نے رومال خریدا ہے، وہ رنگ اسے نہایت مرغوب ہے۔دوسری دکان پر وہ ایک نئے شادی شدہ جوڑے کو کچھ آرائش کی اشیاء خریدتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کے دل میں عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔مثلاً دلہن دلہا سے زیادہ خوبصورت ہے۔اسے نہ صرف ساڑھی پہننے کا سلیقہ ہی آتا ہے۔ بلکہ اسے ساڑھی کا کنارا چننے میں بھی کمال حاصل ہے۔اس کے آویزے گو قیمتی نہیں مگر خاص برے بھی نہیں۔اس دکان سے وہ ایک ہوٹل میں جاتا ہے، جہاں ہوٹل کی خادمہ کو دیکھ کر اسے اپنی محبوبہ یاد آجاتی

ہے۔ ہوٹل سے نکلتے ہی وہ ایک بھکارن کو دیکھتا ہے، جو پھٹے پرانے کپڑے پہننے کے باوجود اسے نہایت دلکش نظر آتی ہے، وہ اس کی ہتھیلی پر ایک آنہ رکھ دیتا ہے اور آہستہ سے پوچھتا ہے کیا تم شادی شدہ ہو۔ مگر بھکارن کا جواب سنے بغیر آگے چلا جاتا ہے۔ بازار کے اخیر پر وہ ایک پاگل آدمی کو سکول کے لڑکوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہے اور اسے پکڑ کر گھر لے آتا ہے۔

اس قسم کا افسانہ پڑھتے وقت آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ شاید کہانی اگلے صفحہ پر شروع ہوگی مگر ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ آپ بیشک انتظار کیے جائیں۔ کہانی کا ہیرو ہرگز کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا، جس سے پلاٹ میں باقاعدگی کے پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ افسانہ ختم ہو جاتا ہے، اور آپ کی مایوسی غصے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے افسانے عموماً ''2 فرلانگ لمبا بازار'' یا ''دس منٹ بازار میں'' کے عنوان سے یاد کیے جاتے ہیں اور موجودہ دور کے افسانوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

(5) حقیقت نگاری

موجودہ افسانوں کی ایک قسم وہ ہے جس میں حقیقت نگاری کو معراج پر پہنچایا جاتا ہے، اس قسم کے افسانوں میں ہر ایک چیز تفصیل سے بیان کی جاتی ہے اور جزئیات اس افراط سے دی جاتی ہیں کہ بعض دفعہ پڑھنے والے کا سر چکرا جاتا ہے۔ مثلاً ہماری گلی میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ ہماری گلی کا طول 70 فٹ 8 انچ اور عرض 20 فٹ 4 انچ ہے، گلی کا فرش نہایت خستہ حالت میں ہے جگہ بہ جگہ اینٹیں اکھڑی پڑی ہیں، ایک جگہ تو ایسا گڑھا پیدا ہوگیا ہے کہ اس کو پر کرنے کے لیے 200 اینٹیں درکار ہیں۔ جو بزرگ ہماری گلی میں رہتے ہیں۔ ان کی عمر ساٹھ سال اور آٹھ ماہ ہے۔ ان کی ڈاڑھی کے ستر فیصدی بال سفید ہو چکے ہیں۔ وہ ایک لال رنگ کی ٹوپی پہنتے ہیں، جس پر تقریباً ایک سو بیس دھبے گرد اور تیل کے ہوں گے۔ یہ بزرگ ہر روز صبح 6 بج کر پچاس منٹ پر اپنے کتے کو ساتھ لے کر سیر کو جاتے ہیں۔ ان کے کتے کا رنگ خاکی مائل سیاہ ہے۔ قد کوئی دس انچ اور دم 3 انچ ہوگی۔ سیر کرتے وقت پہلے پانچ منٹ میں یہ کتا ان بزرگ کے سامنے دوڑتا جاتا ہے، اس کے بعد وہ ان کے پیچھے ہو لیتا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ اس قسم کے افسانوں میں کوئی فقرہ بغیر تشریح کے نہیں لکھا جاتا۔ مثال کے طور پر

صرف اتنا ہی لکھنا کافی نہیں کہ ''ہیرو نے سیب کاٹا'' یہ فقرہ اس طرح لکھا جائے گا۔اس نے اپنے کوٹ کی دائیں جیب سے بہت دیر تک ٹٹولنے کے بعد چاقو کی بجائے پنسل نکالی۔وہ پھر جیب میں چاقو کو ڈھونڈھنے لگا۔چند منٹوں میں وہ چاقو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔یہ چاقو اس نے وزیر آباد میں ایک روپیہ دس آنے میں خریدا تھا۔اس کا دستہ ہڈی کا اور پھل فولاد کا تھا۔اس نے چاقو سیب پر رکھا مگر سیب پھدک کر ایک طرف کو سرک گیا اور جلدی میں اس نے سیب کی بجائے اپنی انگلی کاٹ ڈالی''۔

اسی طرح یہ فقرہ کہ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا،اس طرح ادا کیا جائے گا۔''افق کے اوپر روشنی کا ایک لال لال گولا بہت عرصہ تک ناچتا رہا۔اس کے خونی ناچ سے لہو کی دھاریں دور دور تک پھیلتی گئیں۔یہ دھاریں آہستہ آہستہ لال لال رنگ کی لکیروں میں تبدیل ہوتی گئیں۔کچھ دیر کے بعد ان لکیروں کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوتا گیا۔اب گولے کی جگہ ایک سیارہ رنگ کے طوق نے لے لی۔یک لخت یہ طوق افق سے ابھرا اور پھر اس نے افق سے نیچے چھلانگ لگائی اور غائب ہو گیا''۔

(6) رومانی افسانے

اب آخر میں کچھ رومانی افسانوں کے متعلق عرض کرتا ہوں۔رومانی افسانوں کا پس منظر عموماً کشمیر کی وادی، ڈل لیک یا دریائے جہلم ہوتا ہے۔ان میں عموماً ناؤ یا شکارے میں بیٹھ کر عشق کیا جاتا ہے۔اکثر چند روز بے تحاشا عشق کرنے کے بعد کہانی کا ہیرو گھر لوٹ آتا ہے اور بیچاری معشوقہ گھل گھل کر مر جاتی ہے یا اگر وہ زندہ رہتی ہے۔تو اس کی زندگی بے رنگ و بو ہو جاتی ہے۔اکثر رومان کا ان افسانوں میں یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ مصنف جو اب تک افلاس کی وجہ سے کشمیر نہیں جاسکا،اپنے آپ کو (عالم خیال میں) ڈل لیک میں ایک نہایت خوبصورت شکارے میں بیٹھا ہوا پاتا ہے اور اسے ایک ایسی کشمیری لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے جس کی شکل اس نے کسی باتصویر رسالے میں دیکھی تھی۔اس حقیقت کو نہایت رنگین فقرات میں چھپایا جاتا ہے اور چنار، صنوبر، امیرا کدل، ہاؤس بوٹ کے الفاظ استعمال کر کے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ نہ صرف مصنف کشمیر گیا تھا، بلکہ اس کا وطن یا مسکن کشمیر ہی ہے۔بسا اوقات مصنف جنسی بھوک کا

شکار رہتا ہے۔ چنانچہ وہ افسانوں میں خیالی معشوقوں سے افلاطونی محبت کرنے کے بعد نہیں جانتا کہ اب اس کے بعد کیا کیا جائے۔ اگر ہیرو اور ہیروئن کی شادی کی جائے، تو افسانہ رومانی نہیں رہتا اور اگر ہیرو خودکشی کر لے تو افسانہ جذباتی بن جاتا ہے۔ اس لیے اس کا ہیرو کشمیر سے بھاگنے میں ہی مصلحت سمجھتا ہے۔ رومانی افسانوں میں وہ افسانے بھی شامل کیے جا سکتے ہیں جن میں کوئی بیمار، ہسپتال کی نرس یا کسی ایسی شادی شدہ عورت سے جو تیمارداری کرنے کے لیے آئی ہو، محبت کرتا ہے جب کبھی اس کا درجہ حرارت 104 یا 105 سے اوپر جاتا ہے تو اسے عشق کا دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اسے ٹائیفائیڈ ہے یا عشق۔ چنانچہ ایک طرف اگر وہ ایڑیاں رگڑتا ہے تو دوسری طرف نرس کا ہاتھ اس زور سے بھینچتا ہے کہ وہ بیچاری درد کے مارے چلا اٹھتی ہے۔ مگر کوڑ مغز ہونے کی وجہ سے یہ نہیں سمجھتی کہ مریض اس سے اظہار عشق کر رہا ہے۔

☆☆☆

اخبار بینی

جس طرح گاؤں میں تقریباً ہر ان پڑھ دیہاتی مزدور یا کاشتکار ہونے کے علاوہ ''حکیم'' ہوتا ہے، اسی طرح شہر میں ہر ایک پڑھا لکھا شہری طالب علم یا کلرک ہونے کے علاوہ ''اخبار بین'' ہوتا ہے مگر اخبار بینوں کی بھی جماعتیں ہیں۔ پہلی جماعت تو ان اشخاص کی ہے جو وقتاً فوقتاً میاں فضل کریم کے بک ڈپو کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں ''السلام علیکم''، ''خیریت عافیت'' جیسی رسمی گفتگو کے بعد مالک دکان کے کاروبار میں سطحی قسم کی دلچسپی کا اظہار کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ انہیں ''فضل بک ڈپو'' نہایت عزیز ہے۔ اس کے بعد اخبارات اور رسائل اٹھا اٹھا کر یوں پڑھنا شروع کرتے ہیں گویا فضل بک ڈپو، فضل بک ڈپو نہیں۔ بلکہ پبلک لائبریری ہے۔ یہاں صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔ مطالعہ کے دوران میں میاں فضل کریم کی آنکھ بچا کر کوئی اچھا شعر یا کسی ایکٹریس کا پتا اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے جاتے ہیں اور ہر ایک رسالہ کی ورق گردانی کرنے کے بعد اسے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ غلط جگہ پر رکھتے جاتے ہیں۔ جب علمی اور ادبی رسائل پڑھ چکے تو فلمی رسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''اوہو! مصور نے کتنا ضخیم ''ایکٹریس نمبر'' نکالا ہے۔ بھئی سرورق پر ستارہ کی تصویر تو

خوب زیب دے رہی ہے''۔اے یہ کیا ''فلم انڈیا'' نے ابھی سے سالنامہ شائع کر دیا۔ ذرا دیکھیں۔کوئی کام کی تصویر بھی ہے یا نہیں؟'' اس طرح ایک دو گھنٹہ اخبار بینی کا شغل جاری رہتا ہے۔اس کے بعد میاں فضل کریم پر سوالات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے اور ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ولائتی ڈاک کے آنے میں اس دفعہ اتنی تاخیر کیوں ہوئی۔ان کے ڈپو میں ''ٹرو سٹوری' 'اور ٹرو رومانس'' کیوں نظر نہیں آتے؟ رسالہ ''ادب عالم'' کیوں بند ہو گیا؟ چلتے چلتے انہیں یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ ''ادب لطیف'' کا افسانہ نمبر خوب ہے، اور ہزاروں کی تعداد میں بکے گا۔ہم بھی ایک کاپی مول نہیں لیں گے۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اخبار بینی کے لیے اپنے ہمسائے کے مرہون منت ہیں۔اگر وہ ہوسٹل میں رہتے ہیں تو ایک ایسا ساتھی تلاش کرتے ہیں۔جو روزانہ اخبار خریدنے کا عادی ہو۔سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیتے ہیں۔''اٹھو بھائی اب تو پانچ بج گئے۔ابھی تک بستر میں پڑے ہو''۔

آپ لیٹے لیٹے جواب دیتے ہیں۔''سونے بھی دو یا۔''

''واہ! سونے کی ایک کہی۔اجی اس وقت تک کون سوتا ہے۔اچھا دروازہ کھولو۔تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے''۔

طبوعاً و کرہاً آپ دروازہ کھولتے ہیں۔اور وہ کرسی پر دراز ہو کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔پیشتر اس کے کہ ان کی اس بدتمیزی کی داد دے سکیں، وہ میز پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھا کر اس کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ایک گھنٹہ کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے گویا اخبار انہوں نے ہی خریدا تھا، جس وقت گھڑی آٹھ بجاتی ہے، وہ چپکے سے اخبار میز پر رکھ کر اور ''آج تو کوئی دلچسپ خبر نہیں'' کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں۔

بصورت دیگر اگر آپ گلی یا محلے میں رہتے ہیں تو وہاں بھی آپ کو کئی ایسے حضرات ملیں گے جو سالہا سال سے آپ سے اخبار مانگ کر پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔وقت بے وقت وہ آپ کی بیٹھک میں آ دھمکیں گے، اور آپ کے ماتھے کے شکن کو دور کرنے کے لیے دو چار تعریفی یا ہمدردانہ فقرے جڑ دیں گے مثلاً ''اخاہ۔نیا سوٹ پہنا ہے۔کپڑا تو خوشنما ہے۔سلا ہوا بھی اچھا ہے۔''یا'' منی کا کیا حال ہے۔چھوٹے میاں کی کھانسی میں کچھ افاقہ ہوا؟'' آپ ان باتوں کا

اصلی مقصد اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ مگر کیا کیا جائے کہ بیسویں صدری ہے اور جو بات دل میں ہے وہ زبان پر نہیں لائی جا سکتی۔ ورنہ آپ انہیں کہہ سکتے ہیں۔ ''اجی منی مرے یا بچے۔ تمہاری بلا سے چھوٹے میاں کو کالی کھانسی ہو۔ یا تپ دق۔ آپ تو اخبار پڑھنے آئے ہیں۔ سو اٹھایئے اور پڑھ لیجئے''۔

تیسری جماعت ان افراد کی ہے جو اخبار بینی کے لیے لائبریریوں کے محتاج ہیں۔ اس جماعت میں زیادہ تر ریٹائرڈ کلرک اور سال خوردہ وکلا ہوتے ہیں۔ یہ اصحاب اصل میں اخبار پڑھنے نہیں بلکہ وقت کاٹنے آتے ہیں۔ لائبریری کے کھلنے کے وقت سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے یہ لائبریری کا طواف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ادھر دروازہ کھلا، ادھر یہ داخل ہوئے۔ ان کو دیکھ کر کئی نو وارد سمجھ لیتے ہیں۔ کہ شاید لائبریری کے انچارج یہی ہیں۔ ان کے پڑھنے کا طریق بھی نرالا ہے یعنی ایک اخبار یا رسالہ گود میں ہے اور دو اخبار ہاتھ میں۔ حریص اتنے ہیں کہ کسی اور کو اس وقت تک اخبار نہ اٹھانے دیں گے جب تک الف سے لے کر ی تک سارا اخبار نہ پڑھ لیں۔ آپ نے جرات کر کے ان کی گود میں پڑے ہوئے رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور انہوں نے عینک درست کر کے کچھ اس طرح خشم آلود نگاہوں سے آپ کی جانب دیکھا، گویا کچا ہی چبا جائیں گے۔ آپ نے ہاتھ نیچے کھینچ لیا، اور انہوں نے خالی ہاتھ رسالے پر رکھ لیا۔ اب آپ منتظر ہیں کہ وہ رسالہ ان کے پنجے سے چھوٹے اور آپ پڑھیں۔ مگر یہ موہوم خیال ہے کیوں کہ بڑے میاں جب تک اس اخبار کا جوان کے ہاتھ میں ہے، مطالعہ نہیں کر لیتے، رسالہ کی باری نہیں آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ تنگ آ کر چلے آتے ہیں۔ مگر جب بھی جاتے ہیں، تقریباً اسی قسم کے لوگوں کو رسائل اور اخبارات پر قابض پاتے ہیں۔

یہ بات بھی نہایت دلچسپ ہے کہ یہ لوگ ہر ایک اخبار میں انہی خبروں کو دوبارہ سہ بارہ پڑھ کر ایک عجیب خوشی محسوس کرتے ہیں اور گھر آ کر اپنے احباب کے زمرے میں انہی خبروں کی بنا پر بڑے بڑے عالمانہ اور فاضلانہ تبصرے کرتے ہیں۔ عموماً سنسنی پیدا کرنے والی خبریں ان کا دل پسند موضوع ہوتی ہیں۔ ''اجی سنا آپ نے مراد آباد میں ایک لڑکا لڑکی بن گیا۔ اجی پڑھا آپ نے، بریلی میں عین شادی کے دن دلہن غائب ہوگئی۔ کیا کہا آپ کو یقین نہیں آتا۔ سترہ تاریخ کا ''احسان'' اٹھا کر دیکھ لیجئے''۔

ان کے علاوہ اخبار بینوں کی ایک اور جماعت ہے کہ جس سے ریل گاڑی میں سابقہ پڑتا ہے۔ایک دو باتصویر رسائل،ایک آدھ اخبار لے کر جونہی آپ ڈبے میں داخل ہوئے، چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ یہاں بیٹھئے گا، یہاں آئیے گا۔آپ سیٹ پر بیٹھے اور آپ کے ہم سفروں نے باری باری اخبارات اور رسائل مانگنے شروع کر دیئے۔حتیٰ کہ پانچ منٹ کے بعد آپ بالکل کورے رہ گئے اور سوچنے لگے۔ابھی تو اخبار کھولا بھی نہیں تھا۔اگر یہی بات تھی تو اخبار خریدنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔اب جوں جوں نئے آدمی نئے سٹیشنوں پر آتے جاتے ہیں۔آپ کے اخبار پر نئے نئے حملے ہوتے رہتے ہیں۔اگر صفحہ نمبر ایک آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر کے ہاتھ میں ہے تو صفحہ نمبر دس ڈبے کے انتہائی کونے والے بزرگ پڑھ رہے ہیں اور صفحہ نمبر بارہ کھینچا تانی میں آدھا آدھا ہو کر دو شریف آدمیوں کو محظوظ کر رہا ہے۔تقریباً آپ کا تمام سفر اس انتظار میں گزر جاتا ہے کہ اخبار ملے اور آپ بھی ایک آدھ خبر پڑھ لیں۔اس اثنا میں اگر آپ کی آنکھ لگ گئی تو اخبار تک غائب ہو گیا۔کیونکہ کوئی بزرگ غلطی سے یا اس وجہ سے کہ آپ کے اخبار کے سرورق پر کسی ایکٹرس کی رنگین تصویر تھی،اترتے وقت اخبار بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔بہر حال جب منزلِ مقصود آتی ہے۔تو آپ اٹھ کر اخبار کا ایک ایک ورق اکٹھا کرتے ہیں،لیکن پڑھنے والے ہیں کہ پھر بھی اخبار چھوڑنے میں نہیں آتے۔جب آپ سٹیشن پر اترتے ہیں اور اخبار کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ یا تو پرسوں اترسوں کا کوئی پرانا پرچہ ہے یا ردی کے چند کاغذ ہیں،جن میں شاید آپ کوئی کپڑا یا کتاب لپیٹ لائے تھے۔

☆☆☆

قومی لباس

(1)

مسلم گنج......اجمیر

ڈیئر پنڈت ہیرا لال

تسلیم۔میں اس خط میں ایک نہایت اہم مسئلہ کے متعلق آپ سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں،چونکہ آپ آجکل بے کار ہیں اور آپ کے پاس کافی وقت ہے۔اس لیے امید ہے

کہ آپ مجھے اپنی قیمتی رائے سے مستفید کریں گے۔ جیسا کہ آپ پر بخوبی روشن ہے، قومی زبان کے مسئلہ پر اب کافی لے دے ہو چکی ہے، لاتعداد مباحثے کئے جا چکے ہیں، متعدد کانفرنسیں منعقد کی گئی ہیں اور ایک دوسرے کو کافی صلواتیں سنائی جا چکی ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کا ذکر کرنا تو گڑے مردے اکھیڑنے کے مترادف ہوگا۔ مگر کیونکہ بدقسمتی سے ہم لیڈر واقع ہوئے ہیں اور نچلا بیٹھنا ہماری سرشت میں داخل نہیں۔ اس لیے اب ہمیں کوئی نیا مشغلہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ ہندوستان کے ''قومی لباس'' کے متعلق غور وخوض کیا جائے۔ آپ اس بات کے متعلق ہرگز پریشان نہ ہوں کہ مجھے یا آپ کو اس مسئلہ پر غور وخوض کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ دراصل قومی مسائل کو منظرِ عام پر لانے کا ہر ایک لیڈر اہل ہے۔ اس لیے پیشتر اس کے کوئی اور لیڈر اس مسئلہ کو بحث کا مضمون بنائے، کیوں نہ ہم ہی اسے اپنی شہرت کا وسیلہ بنائیں۔ میری دوسری تجویز یہ ہے کہ آج سے آپ مجھے نو کروڑ مسلمانوں کا واحد نمائندہ سمجھیں، اور میں آپ کو 30 کروڑ ہندوؤں کے تمدن کا محافظ۔

براہ کرم اپنے خط میں چند عملی تجاویز پیش کریں کہ ہندوستان میں کس لباس کو قومی لباس کا نام دیا جائے۔

آپ کا مخلص......اکبر علی

(2)

کرشن نواس......بنارس

مائی ڈیئر مولانا اکبر علی

آداب عرض۔ نوازش نامہ آپ کا ملا۔ قومی لباس کا مسئلہ، میرا مطلب ہے مشغلہ نہایت دلچسپ ہے۔ واقعی قومی زبان کے متعلق اب کچھ لکھنا یا کہنا تحصیل لاحاصل ہے۔ دیگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ زبان کے مسئلہ سے لباس کا مسئلہ کہیں زیادہ اہم ہے کیونکہ ایک غیر ملک کا باشندہ جب ہمیں دیکھتا ہے تو سب سے پہلے اس کی نظر ہمارے لباس پر پڑتی ہے۔ نیز زبان کے متعلق تو ہم اس مقولے پر بھی عمل کر سکتے ہیں کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد ۔۔۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

میرا مطلب ہے۔ ہم چپ بھی سادھ سکتے ہیں، تا کہ ایک غیر ملک کے باشندے کو یہ علم ہی نہ ہو کہ ہندوستان میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ مگر لباس کے متعلق ہم اپنی کمزوری کسی طرح بھی نہیں چھپا سکتے۔ اس لیے میں آپ سے متفق ہوں کہ ہندوستان کے لیے ایک قومی لباس تجویز کیا جائے۔

مجھے آپ کی دوسری تجویز سے کیا اختلاف ہوسکتا ہے۔ اگر آپ مجھے تیس کروڑ ہندوؤں کی تہذیب کا محافظ تسلیم کرتے ہیں، تو بھلا مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے، کہ میں آپ کو نو کروڑ مسلمانوں کا واحد نمائندہ تسلیم نہ کروں۔

اب رہا عملی تجاویز پیش کرنے کا معاملہ۔ تو سب سے پہلے ہمیں ان مختلف قسم کے لباسوں کی فہرست مرتب کرنی چاہیے، جو ہندوستان میں رائج ہیں۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ان میں کونسا لباس ہماری تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ ایک اور امر جو غور طلب ہے، وہ یہ ہے کہ قومی لباس منتخب کرتے وقت ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ صنف نازک نظر انداز نہ ہو جائے۔ اس لیے میرے خیال میں آپ مردوں کے لباس کی فہرست تیار کریں، اور میں عورتوں کے لباس کی۔ ایک ہفتے کا عرصہ اس کام کے لیے کافی ہوگا۔

آپ کا خیر اندیش...... ہیرالال

(3)

مسلم گنج...... اجمیر

مائی ڈیئر ہیرالال

تسلیم۔ آپ کے ارشاد کے بموجب میں مردوں کے لباس کی فہرست ارسال کر رہا ہوں، اس فہرست کو تیار کرنے میں مجھے زیادہ ریسرچ نہیں کرنی پڑی کیونکہ جہاں تک لباس کا تعلق ہے، میرا اپنا خاندان ایک اچھے خاصے عجائب گھر کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ والد بزرگوار ''اگلے وقتوں'' کے آدمی ہیں۔ اس لیے تہد، کرتا اور پگڑی میں ملبوس رہتے ہیں۔ ان کی پگڑی کا طول ''طول شب فراق'' کے مانند کوئی حساب داں آج تک نہیں ماپ سکا۔ میں خود پکا مسلمان ہوں۔ اس لیے شلوار، قمیض اور ترکی ٹوپی کے حق میں ہوں۔ بڑا لڑکا انگریزی داں اور انگریز پرست ہے

اس لیے پتلون، کوٹ پینٹ کا دلدادہ ہے۔ چھوٹا لڑکا علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم ہے، اس لیے پاجامہ، شیروانی اور ترکی ٹوپی کا عاشق ہے۔ گھر میں دو نوکر ہیں جو تہمد اور بنیان میں گزارہ کرتے ہیں۔ ایک ماموں یونینسٹ پارٹی کے رکن ہیں اور وہ شلوار، قمیص اور کلاء کی جانب مائل ہیں۔ تین کم سن بچے ہیں، جو عموماً ننگے ہی رہتے ہیں۔ اب صرف ایک قسم کا لباس باقی رہ جاتا ہے، جو میرے خاندان کا کوئی فرد نہیں پہنتا۔ اور وہ ''لنگوٹی'' ہے۔ یہ لباس ہندوستان میں مہاتما گاندھی کے علاوہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ مجھے اس میں کلام ہے کہ لنگوٹی کو لباس بھی کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ بہر حال آپ کی واقفیت کے لیے لکھے دیتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ نے وعدہ کے بموجب عورتوں کے لباس کی فہرست تیار کر لی ہوگی۔ اگر نہیں کی تو جلد تیار کریں کیونکہ اس کے بغیر ہم کسی تسلی بخش نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں گے۔

آپ کا دوست...... اکبر علی

(4)

کرشن نواس...... بنارس

مائی ڈیئر اکبر علی

تسلیم۔ خط آپ کا ملا۔ آپ کی ارسال کردہ فہرست قدرے غیر مکمل معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے ہندوؤں کے لباس کا ذکر تک نہیں کیا اور اس طرح تیس کروڑ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ کسی حد تک بہت سے ہندو بھی تقریباً اسی قسم کا لباس پہنتے ہیں جس قسم کا آپ کے خاندان کے افراد مگر کم از کم لباسوں کی فہرست میں ''دھوتی'' کا ذکر ضرور آنا چاہیے کہ یہ ہندوؤں کا مقبول اور مرغوب لباس ہے۔ دیگر آپ نے ترکی ٹوپی اور کلاہ کا ذکر تو کیا مگر کرسٹی ٹوپی کو بالکل فراموش کر دیا۔ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ہندوؤں کے پاس کلاہ کا اگر کوئی جواب ہے تو وہ کرسٹی ٹوپی ہی ہے۔

اب رہا عورتوں کے لباس کا معاملہ۔ تو میں بھی آپ کے نقش قدم پر چلتا ہوں اور اپنے خاندان سے ہی فہرست مرتب کرتا ہوں۔ دادی محترمہ پرانی وضع کی ہیں۔ اس لیے ''لہنگا''، قمیص اور دوپٹا کو بہترین لباس خیال کرتی ہیں۔ میری اہلیہ دور جدید میں پیدا ہوئیں، اس لیے

شلوار، قمیص اور دوپٹا کی طرف دار ہیں۔ بڑی لڑکی کالج میں پڑھتی ہے اس لیے ساڑھی اور جمپر کے علاوہ باقی تمام لباسوں کو فضول سمجھتی ہے۔ چھوٹی لڑکی کرسچین سکول کی طالب علم ہے، اس لیے یوروپین لباس پر جان دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دو مامائیں ہیں، جو پھٹے پرانے کپڑوں سے اپنا تن ڈھانکتی ہیں۔ انہیں کسی قسم کے لباس پہننے میں عار نہیں، بشرطیکہ انہیں وہ لباس بلا قمیت مہیا کیا جائے۔

امید ہے کہ آپ اس فہرست سے مطمئن ہوں گے۔

مخلص...... ہیرا لال

(5)

مسلم گنج...... اجمیر

ڈیئر پنڈت جی

تسلیم۔ آپ کا خط ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ دیگراں را نصیحت خود را فضیحت، کے مقولے پر عمل کرتے ہیں۔ آپ نے یہ تو لکھ دیا کہ میں نے دھوتی کا ذکر نہ کر کے تیس کروڑ ہندوؤں کے جذبات کو مجروح کیا مگر عورتوں کے لباس کی فہرست تیار کرتے وقت آپ یہ بھول گئے کہ جب تک اس میں برقعہ کا ذکر نہ کیا جائے کوئی غیرت مند مسلمان اس فہرست پر ایمان نہیں لائے گا۔ یاد رکھیے ہم مسلمان چاہے اور کسی معاملے میں دیگر اقوام سے پیچھے ہوں، جہاں تک غیرت کا سوال ہے، ہم دنیا کی سب قوموں سے پیش پیش ہیں۔ اس لیے اس فہرست میں برقعہ کا تذکرہ آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔

اب رہا یہ سوال کہ ان متعدد لباسوں میں سے کونسا لباس منتخب کیا جائے تو میرے خیال میں جہاں تک مردوں کے لباس کا تعلق ہے۔ شلوار، کرتا اور ترکی ٹوپی نہایت موزوں رہیں گے کیوں کہ شلوار ایک خالصتاً ہندوستانی چیز ہے۔ میرا مطلب ہے کہ گو یہ افغانستان سے ہندوستان میں لائی گئی مگر یہ اتنے عرصہ سے پہنی جا رہی ہے کہ اس کی اجنبیت زائل ہو چکی ہے۔ کرتا بھی سو فیصدی ہندوستانی ایجاد ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سوائے ہندوستان کے کسی اور ملک میں پہنا نہیں جاتا۔ ترکی ٹوپی کے ہندوستانی ہونے میں شاید کسی کو کلام ہو مگر یہ ایسی خوبصورت چیز ہے کہ محض اس وجہ سے کہ یہ کسی وقت ترکی میں پہنی جاتی تھی ہم اسے

ترک نہیں کر سکتے۔ پاؤں کے لیے یقیناً جوتی ہی مناسب رہے گی۔ اب صنف نازک کے لباس کی طرف آیئے۔ یہاں بھی میری ناچیز رائے میں شلوار سے ابتدا اور دوپٹا پر انتہا کی جائے۔ لازماً قمیص اس لباس میں شامل کرنی پڑے گی۔ امید ہے کہ آپ میری تجاویز سے متفق ہوں گے۔ اگر آپ کو مجھ سے اختلاف ہو تو لکھیں۔

مخلص...... اکبر علی

(6)

کرشن نواس...... بنارس

ڈیئر مولانا اکبر علی

آداب عرض۔ آپ کی تجاویز کا میں نے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قومی لباس تجویز کرتے وقت یہ فرض کر لیا ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلمان بستے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو آخر آپ شلوار کی تعریف میں کیوں اس قدر رطب اللسان ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کوئی خوددار ہندو اس بات کو گوارا نہیں کرے گا کہ شلوار کو کہ جو ہندوؤں کے دورِ محکومی کی یادگار ہے، از سرِ نو فروغ دیا جائے۔ یہ شلوار ہی تھی جس نے .... دھوتی کی عظمت کو تباہ اور برباد کیا تھا۔ اس لیے میری قوم کبھی اس بات کو منظور نہ کرے گی کہ دھوتی کو سرے سے موقوف کر کے شلوار کو رائج کیا جائے۔ دوسری ناقابلِ عمل تجویز جو آپ نے پیش کی ہے وہ ترکی ٹوپی کے متعلق ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ چیز ہم نے ترکوں سے مستعار لی۔ اس لیے یہ خالصتاً غیر ہندوستانی چیز ہے۔ مقامِ تعجب ہے کہ جس چیز کو خود ترکوں نے ترک کر دیا، آپ اسے ہندوستان میں مقبول کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ خود غازی کمال پاشا نے ترکی ٹوپی کے خلاف جہاد کیا اور آج کل بہت کم ایسے ترک ملیں گے جو ترکی ٹوپی کے مداح ہوں۔ میرے خیال میں آپ کی یہ تجویز نہ صرف جانبدارانہ، ہے بلکہ متعصبانہ بھی۔ اور چونکہ میں تیس کروڑ ہندوؤں کی تہذیب کا محافظ ہوں اس لیے مجھے آپ کی اس تجویز سے سراسر اختلاف ہے۔ میرے خیال میں خالصتاً ہندوستانی چیز ''دھوتی'' ہے۔ یہ لباس پتھر اور دھات کے زمانے سے برابر ہندوستان میں پہنا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ

ہندوستان کے دیہاتوں میں اس لباس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے میں یہ ترمیم پیش کرتا ہوں کہ شلوار کی بجائے مردوں کے دھوتی اور عورتوں کے لیے ساڑھی تجویز کی جائے۔ ترکی ٹوپی کی بجائے کسی ہندوستانی ٹوپی (میری مراد گاندھی کیپ سے نہیں) یا پگڑی کو موقع دیا جائے۔ امید ہے۔ کہ آپ، جب ٹھنڈے دل سے اس ترمیم پر غور کریں گے تو اس کی صداقت آپ پر عیاں ہو جائے گی۔

آپ کا دوست ..... (ہیرالال)

(7)

کرشن نواس ..... بنارس

ڈیئر پنڈت جی

آداب عرض۔ آپ کی ترمیم نہایت فضول اور بے معنی ہے۔ اسے کوئی باوقار مسلمان منظور نہیں کرسکتا۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ میری قوم اتنی گئی گزری ہے کہ اپنے بزرگوں کے لباس کو دیدہ دانستہ صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ یاد رکھیے۔ شلوار اسلامی شان وشوکت یعنی اسلامی عہد رنگیں کی یادگار ہے۔ یہ فاتح مسلمانوں کا لباس ہے۔ یہ پٹھان اور مغل بادشاہوں کی چہیتی ہے۔ اس لیے کوئی مسلمان دھوتی کو اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ دوسرے دھوتی ایک دیہاتی لباس ہے اور کوئی تعلیم یافتہ شہری اس لباس کو پسند نہیں کرے گا۔ آپ کا ترکی ٹوپی کے متعلق اعتراض بھی غیر معقول اور غیر وزن دار معلوم ہوتا ہے۔ اس ٹوپی کا نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک غیر جانبدارانہ چیز ہے۔ یعنی نہ ہندوؤں کی نہ مسلمانوں کی۔ بلکہ ترکوں کی۔ اگر آپ ہیٹ پہن سکتے ہیں تو ترکی ٹوپی نے کیا گناہ کیا ہے کہ آپ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ دیگر آپ نے عورتوں کی لیے ساڑھی تجویز کی ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ساڑھی ایک نہایت قیمتی لباس ہے۔ جس کو صرف امیر آدمی ہی خرید سکتے ہیں۔ دوسرے ساڑھی کے فیشن اس سرعت سے بدلتے ہیں کہ بہت کم ہندوستانی عورتیں صحیح فیشن کی ساڑھی پہننے کے حق ادا کرسکتی ہیں۔ اس لیے آپ اپنی ترمیم پر پھر غور کریں اور تعصب اور دلیل بازی کو بالائے طاق رکھ کر میری پہلی تجویز منظور فرمائیں۔

آپ کا دوست ..... اکبر علی

(8)

کرشن نواس...... بنارس

مائی ڈیئر اکبر علی

تسلیم۔آپ کا خط پڑھتے ہی میرا بلڈ پریشر (Blood Pressure) حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ میرے ڈاکٹر نے مجھے رائے دی ہے کہ میں پالیٹیکس سے کچھ عرصہ کنارہ کش ہو جاؤں اس لیے آپ کے خط کا جواب کچھ دیر کے بعد دوں گا۔

آپ کا خیراندیش...... ہیرالال

(9) (تار)

صحت سے مطلع فرمائیے۔ پہلے خط کے جواب کا منتظر

اکبر علی

(10)(تار)

بلڈ پریشر (Blood pressure) نارمل۔خط کا جواب پرسوں تک۔

ہیرالال

(11) کرشن نواس...... بنارس

مائی ڈیئر اکبر علی

آداب عرض۔خدا کے فضل سے اب میرا بلڈ پریشر نارمل ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی لباس جیسا اہم مسئلہ صرف خط کتابت سے طے نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں۔کہ کسی ملاقات کے موقع پر اس سوال کا تصفیہ کیا جائے میں ممنون ہوں گا۔اگر آپ میرے پاس بنارس 15 ماہ حال کو تشریف لے آئیں۔امید ہے آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا۔

ہیرالال

(12) مسلم گنج...... اجمیر

ڈیئر پنڈت جی

تسلیم۔مناسب یہ ہوگا کہ آپ اجمیر آ جائیں۔کیونکہ میری خوددارانہ طبیعت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں چل کر آپ کے شہر آؤں۔

اکبر علی

(13) کرشن نواس...... بنارس

ڈیئر مولانا

تسلیم۔اگر آپ بنارس نہیں آسکتے تو میں بھی ایسا بے غیرت نہیں کہ آپ کے پاس اجمیر دوڑتا آؤں۔لہٰذا آپ اس بات کا فیصلہ کریں کہ ملاقات کس طرح کی جائے۔

ہیرالال

(14) مسلم گنج......اجمیر

مائی ڈیئر ہیرالال

تسلیم۔میرے خیال میں نہ آپ اجمیر آئیں نہ میں بنارس آؤں۔ہم دونوں ایک ایک دن دہلی میں کسی ہوٹل میں ملاقات کریں۔میری رائے میں اس طرح ہماری شان خودداری میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

خیراندیش......اکبرعلی

(15)(تار)

منظور ہے۔دہلی کناٹ ہوٹل۔20 ماہ حال

ہیرالال

(16) ملاقات کے بعد
مسلم گنج......اجمیر

مائی ڈیئر ہیرالال

آداب عرض۔دہلی میں جن امورات کا فیصلہ ہوا تھا،وہ یہ تھے کہ ہفتے میں ہندوستانی عورتیں تین دن ساڑھی اور چار دن شلوار پہنیں اور مرد چار دن دھوتی اور تین دن شلوار۔نیز سر پر ہفتہ میں دو دن ترکی ٹوپی،تین دن پگڑی اور دو دن کرسٹی ٹوپی پہنی جائے۔یوروپین لباس کو بالکل ترک کیا جائے،اور ہندوستان کے تمام ہیٹ پتلون۔کوٹ ٹائیاں اکٹھے کر کے جلا دیئے جائیں۔گو اس تصفیہ کو میں دہلی میں مان گیا تھا مگر گھر پہنچ کر محسوس ہوا کہ مسلمانوں کی سخت حق تلفی کی گئی ہے۔نو کروڑ مسلمانوں کا واحد نمائندہ ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں اپنی

قوم کے جائز حقوق کی حفاظت کروں۔اس لیے میں یہ ترمیم پیش کرتا ہوں کہ ہفتے میں عورتوں کو چار دن شلوار اور تین دن ساڑھی یا دھوتی پہننے کی اجازت ہونی چاہیے۔ان چار دنوں میں ایک دن جمعہ کا ضرور شامل کیا جائے۔ترکی ٹوپی کے لیے بھی دو دن کی بجائے تین دن وقف کیے جائیں۔امید ہے کہ آپ میری ان ترمیموں پر غور فرمائیں گے۔

آپ کا خیر اندیش......اکبر علی

(17) کشن نواس......بنارس

مائی ڈیئر مولانا!

تسلیم۔آپ کی تجاویز سراسر لغو ہیں۔دہلی کے تصفیہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

ہیرالال

(18) مسلم گنج......اجمیر

مائی ڈیئر پنڈت جی

تسلیم، مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ میری تجاویز نامنظور کریں گے۔دراصل ہندوؤں سے انصاف کی امید رکھنا موہوم خیال ہے۔میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر تین دن کے اندر آپ نے میری ان تجاویز کو منظور نہ کیا تو میں دہلی کے تصفیہ سے بالکل منحرف ہو جاؤں گا۔

اکبر علی

(19) کرشن نواس......بنارس

مائی ڈیئر اکبر علی

آداب عرض۔مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی تجاویز کو منظور کرنے سے قاصر ہوں۔مجھے نہایت رنج ہوگا اگر آپ دہلی کے تصفیہ سے انحراف کریں گے۔گو اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو مجھے چنداں تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے ملک میں ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ ہم کسی بات کے متعلق متفق نہیں ہو سکے۔مثال کے طور پر قومی جھنڈے،قومی زبان،قومی گیت کے مسائل کو ہی لیجئے۔خیر یہ تو اہم مسائل ہیں،ہم تو آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ ہمارا قومی نعرہ کیا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔اس لیے اگر آپ دہلی کے تصفیہ کو رد

سمجھیں گے تو میں یہی خیال کروں گا کہ دیگر قومی مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی فی الحال ناقابل حل ہے۔اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کرسکتا۔

اگر آپ کو کوئی عذر نہ ہو۔تو ہماری یہ خط کتابت،ایسوسی ایٹڈ پریس کو دے دی جائے تا کہ عوام اس کے مطالعہ سے مستفید ہوسکیں۔

جواب کا طالب ......ہیرالال

(20) مسلم گنج......اجمیر

مائی ڈیئر ہیرالال

تسلیم۔آج سے اس خط کتابت کو بند سمجھئے۔میری طرف سے آپ کو کھلی اجازت ہے کہ آپ یہ خط کتابت پریس کو بھیج دیں۔میرا خیال ہے کہ اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہو جائے گا۔اور کافی عرصہ ''ساڑھی یا شلوار''۔''دھوتی یا پتلون'' کے عنوانوں کے تحت مضامین لکھے جائیں گے،اوران مضامین میں ہم دونوں کا نام نہایت عزت اور احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔اس لیے آپ اپنی پہلی فرصت میں اس خط کتابت کو شائع کرنے کا انتظام کریں۔ اگر میری فوٹو کی ضرورت سمجھیں تو لکھیں،دوسری ڈاک میں بھیج دوں گا۔

مخلص......اکبرعلی

☆☆☆